ماهنامة

حیاتِ نو

بلریاگنج

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد : ۵ —— شمارہ : ۲

جون ۱۹۹۰ء

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

بدلِ اشتراک

سالانہ زرتعاون :	۴۰ روپے
خصوصی تعاون :	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے :	۲۰ امریکی ڈالر
فی شمارہ :	۴ روپے

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس، برائے جمال پرنٹرس دہلی

نقوش حیات نو

ادار یہ		
عشق کے بال و پر کر پیدا	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳
بحث و نظر		
اسلامی قانون جامد کیوں؟	پروفیسر محمد سلیم	۱۲
خواندگی کا مسئلہ اسلامی تناظر میں	ڈاکٹر شبیر محمد زماں	۳۶
تہذیب الاخلاق اور مولانا مودودیؒ	ابو سفیان اصلاحی	۶
ہندوستان میں فرقہ پرستی کے اسباب اور اس کا حل	محمد ادریس فلاحی	۲۱
اسلامی شعور اور جدید مسائل	ڈاکٹر محمد عبد الفتاح الاجی	۴۵
شعر و نغمہ		
الوداع اے جامعہ	ضیاء الرحمان ضیا اعظمی	۳۵
جامعہ سے خطاب	عبد الحمید قلب بستوی	۴۴
اخبار علمیہ		
برطانوی مدارس میں اسلامی نظام تعلیم	شہنواز قمر	۵۹
جامعہ کے لیل و نہار		
جامعہ کے نئے ناظم چند اساتذہ کی جدائی	محمد اسمٰعیل فلاحی	۶۱

ادار یہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

عشق کے بال و پر کر پیدا

متکلم اسلام علامہ شبلی نعمانی کو عربی ادب پڑھنا تھا۔ لاہور کالج کے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم عربی ادب کے بہترین استاد تھے۔ مشغول ترین آدمی، ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ شبلی کو الگ سے وقت دے سکیں۔ وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ کالج آتے اور جاتے ہوئے راستے میں ان سے پڑھا جا سکتا ہے۔ علامہ شبلی نے اسی کو غنیمت جانا۔ وہ بڑی پابندی سے کالج جانے کے وقت اُن کے گھر پہنچ جاتے، کالج تک ساتھ جاتے اور کالج سے واپسی کے وقت دوبارہ کالج آپہونچتے اور اُن کے ساتھ ان کے گھر تک واپس آتے۔ راستہ میں ان سے پڑھتے ہوئے جاتے اور پڑھتے ہوئے واپس آتے۔ اس طرح انہوں نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔

بظاہر یہ چھوٹا سا واقعہ ہے۔ لیکن اس کے پڑھنے میں علم کے لئے شبلی کی پیاس صاف جھلکتی ہے۔ پابندی سے صبح و شام استاد کے ساتھ آنا جانا اور راستہ میں تحصیل علم کرنا علم کے لئے سچی تڑپ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی پیاس اور تڑپ نے انھیں عہد آفریں شخصیت بنا دیا اور ان کے قلم سے الفاروقؓ، المامونؒ، النعمانؒ اور سیرت النبیؐ جیسی بلند پایہ اور شاہکار تصنیفات سامنے آئیں۔

دنیا کے ہر میدان کے لئے یہ بات صحیح ہے اور علم و فن کے لئے صد فیصد

بھی زیادہ صحیح کر اصل چیز طالب علم کی اپنی پیاس، تڑپ اور شوق ہے۔ طلب اگر صادق اور پیاس سچی ہے تو راہ کی ہر رکاوٹ کو دور ہونا ہے۔ راستے کے ہر پتھر کو ہٹنا ہے اور محنت، لگن اور جدوجہد سے ہر کمی کی تلافی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر شوق ہی خام اور پیاس ہی جھوٹی ہو تو عالیشان کتب خانے، عمدہ نصاب تعلیم اور بہترین اساتذہ مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ سچی طلب کے بغیر بڑے سے بڑا کتب خانہ بیکار، اچھے سے اچھے اساتذہ لاحاصل اور لاثانی نصاب بھی بے فائدہ۔ اگر پیاس ہی نہ ہو تو پانی سے نہیں، دودھ اور شہد سے بھرا کنواں بھی اگر آ جائے تو بیکار ہے۔ سچا عشق ہر کمی کی تلافی کر سکتا ہے لیکن اگر سب کچھ ہو اور یہی متاعِ عزیز و گراں بہا نہ ہو تو کوئی چیز بھی اس کا بدل نہیں بن سکتی۔ اس دنیا میں جو کوئی بھی کچھ بنتا ہے اپنی محنت اور لگن سے بنتا ہے۔ اور جنہیں کچھ کرنا اور بننا نہیں ہوتا وہ شکوے اور بہانے ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ درجہ ایک، استاد بھی ایک اور سہولتیں اور پریشانیاں بھی ایک جیسی لیکن اسی درجہ کا ایک طالب علم آسمان پر پہنچ جاتا ہے اور انھیں حالات میں ایک دوسرا طالب علم کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔

مولانا تھانویؒ، علامہ فراہیؒ اور مولانا مودودیؒ کے اساتذہ کوئی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی عبقری شخصیت کے حامل نہیں تھے، اور نہ انھیں آج کے عظیم الشان کتب خانوں کی سہولیات حاصل تھیں۔ لیکن یہ ان کی لگن تھی اور ان کا شوق ہی تھا کہ لالٹین اور لیمپ کی روشنی میں، ٹوٹے پھوٹے کتب خانوں کے سہارے اور معمولی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ کی انگلیاں پکڑ کر وہ پہاڑی کا چراغ بن گئے اور انھوں نے وہ کچھ حاصل کیا اور وہ خدمات انجام دیں کہ آج ایک دنیا ان سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ کیا آج ایسا ممکن نہیں؟

ہر سال سیکڑوں طلبا مدارس سے فارغ ہوتے ہیں اور نہ جانے کہاں

غائب اور کس نہاں خانہ میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ اختصاص اور مہارت بصیرت پیدا کرنے کا دور ہے۔ سرسری اور سطحی علم کافی نہیں، کسی موضوع کا انتخاب کرکے ٹھوس اور گہرا علم حاصل کرنا ہوگا۔ اس میں استاد کی سی نظر اور ماہر فن کا سا ملکہ پیدا کئے بغیر کسی کے لئے کوئی مقام نہیں۔ یہ غلط ہے کہ آج دنیا قدر نہیں کرتی، امر واقعہ یہ ہے کہ علمی میدان میں دنیا سندوں اور ڈگریوں کو نہیں دیکھتی، عبا و قبا اور جبہ و دستار کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ وہ صاحبِ فن اور صاحبِ کمال کو تلاش کرتی ہے اور اگر کوئی صاحبِ کمال مل جاتا ہے تو سر پہ بٹھاتی اور دل و نگاہ میں جگہ دیتی ہے۔ دنیا نے اگر امام ابو یوسف، امام غزالی، شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کی قدر کی اور دلوں میں بٹھایا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ کسی فلاح و اصلاح یا ندوہ و دیوبند کے فارغ تھے یا ان کے پاس لمبی چوڑی ڈگریاں تھیں یا وہ صاحبِ مال و مرتبہ تھے۔ دنیا نے ان کے کمال کی قدر کی ہے اور ان کے کمال کے اندر ہی دراصل ان کا جمال مضمر تھا۔ اور یہ کمال ظاہر ہے الٹے سیدھے، بغیر مطالعہ کے صرف درجہ میں حاضری دینے سے پیدا نہیں ہوگا۔ اگر سردی گرمی، معمولی سر درد، پیٹ درد، شادی بیاہ کی شرکت یا اس طرح کی اور کوئی دوسری چیز مطالعہ میں حارج و مانع بن جائے اور "ہاتھی آیا، ہاتھی آیا" کا شور دل کو لبھائے اور کلاس چھوڑ کر ہاتھی دیکھنے کے لئے دوڑا دے تو پھر کمال کہاں سے اور کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو خود کو گھلانا اور سر کا پسینہ ایڑی پر بہانا ہوگا۔ ہر دوسری چیز سے کنارہ کش ہو کر اسکے لئے لگنا اور مٹنا ہوگا۔ شہد کی مکھی کی طرح ایک ایک پھول کا رس حاصل کرنا اور اسے جذب کرنا ہوگا تب کہیں جا کر کسی فن میں کمال حاصل ہو سکتا ہے۔

آج بھی اگر کوئی امام ابو یوسف اور امام غزالی نظر آئے، کوئی شاہ ولی اللہ بنے اور کوئی سید احمد شہید پیدا ہو تو دنیا کو اپنے لئے بخیل نہیں، کشادہ، فراخ دل اور اپنے انتظار میں پائے گا۔

★ ابو سفیان اصلاحی

تہذیب الاخلاق اور مولانا مودودیؒ

آج اسلام اس قدر مظلوم موضوع بن چکا ہے کہ ہر میدان کا آدمی ہمہ آن مذہب اسلام کے مختلف پہلوؤں پر طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ بالخصوص علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈرائنگ روم اور چیمبرز کا مانوس موضوع بحث ہے۔ اردو میں اسلامیات پر چند کتابوں کے مطالعے کے بعد خود کو مجددین اسلام کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں۔ جب کہ عربی زبان وادب سے مس تک نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حضرات اس کی ابجد سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ابھی چند سالوں پیشتر دلی میں قرآن کانفرنس ہوئی تو اس میں عرب مندوبین بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اردو میں بڑی گرماگرم بحث ہو رہی ہے رفع اضطراب کے لئے ایک ہندوستانی عربی داں سے پوچھ بیٹھے کہ یہ کس مسئلہ پر مناقشہ جاری ہے تو انہوں نے بتایا کہ "ایک طبقہ کا خیال ہے کہ بغیر عربی سے واقفیت کے قرآن فہمی بعید از عقل ہے۔ لیکن دوسرا طبقہ اس بات پر مصر ہے کہ ترجمۂ قرآن کے ذریعہ قرآن کے اسرار و رموز تک نا ممکن ہے۔" یہ سنکر عربی نے زبردست قہقہہ لگایا کہ خدایا تیری دنیا میں اب ایسے بھی پیدا ہو چلے ہیں کہ صرف تراجم کی بنیاد پر خود کو مفسرین کہلانا چاہتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں کہ اسلام کے شعائر سے دور ہونے کے باوجود شعائر اسلام پر فتوے صادر کرتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق (مئی ۱۹۹۰ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے اداریہ میں گھڑی کی افادیت پر محترم مدیر سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پیش کئے جانے والے

ایک سیاح کا واقعہ نقل کیا گیا ہے (حوالہ کے بغیر) "میں سلطان! میں قطب جنوبی کے دور دراز علاقوں میں سفر کر کے آ رہا ہوں! اپنے عرصۂ قیام میں میں نے دیکھا کہ وہاں آفتاب کچھ اس طرح گردش کرتا ہے کہ رات بالکل نہیں ہوتی۔"

اس واقعہ کے بعد مولانا مودودیؒ کے مضمون "اسلام میں عید الفطر کی حقیقی اہمیت" سے ایک اقتباس نقل کیا ہے "خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کئے ہیں جن سے ہر مسلمان کے لئے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے نہیں مقرر کئے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لئے اس کے دین کا ایک جزء بن جائے بلکہ اس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقات نماز کے لئے علامت قرار دیا جنہیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے" (سہ روزہ دعوت ۱۶ مئی ۱۹۹۰ء ج: ۳۶ ، ش: ۳۹)

مذکورہ بالا دونوں اقتباس کی روشنی میں محترم مدیر موصوف نے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج سے نو سو سال قبل محمود غزنوی کے زمانے میں مسلمانوں کو یہ علم تھا کہ دنیا کے کچھ علاقوں میں چھ ماہ مسلسل رات اور چھ ماہ دن ہوتے ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی کے عالم دین مولانا مودودیؒ کو یہ پتہ نہیں کہ دنیا میں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں قدرت کے عالمگیر مناظر سے تعین اوقات نماز نا ممکن ہے، یہاں صرف سائنسی ایجاد یعنی گھڑی تعین اوقات کی جا سکتی۔ مدیر موصوف نے مولانا مودودیؒ کی اس لاعلمی اور عدم توجہی پر اس طرح تبصرہ فرمایا ہے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں عصری علوم پر دسترس حاصل تھی اور جدید ذہن کے بھی مالک تھے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عام طور پر صورت حال کیا ہوگی۔ اس لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو دین کی بنیادی باتوں کا علم ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ علوم دینیہ کے ماہرین کو عصری علوم کی مبادیات سے بھی واقفیت ہو۔"

کے لفظ بولتے ہیں۔ تخاطبات کا دور ہر یادن کا بہر حال صبح و شام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ افق پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اسی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا۔ تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی افق کے آثار تھے، لہذا جس طرح دوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لئے تعین اوقات کا کام دیتے ہیں اسی طرح نماز اور سحری و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔ تفہیم القرآن

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۴/۱

اس تشریح سے مولانا مودودیؒ پر قطبین کے علاقوں سے عدم توجہی کا الزام باقی نہیں رہتا اور نہ ہی یہ بات نکلتی ہے کہ وہ گھڑی کی افادیت کے منکر ہیں بلکہ مولانا نے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کو عالمگیر مظاہر قرار دیا ہے اور گھڑی انہی مناظر کی ترقی یافتہ شکل ہے مولانا پر عدم توجہی کا الزام کی مزید تردید کے لئے آئیے ہم رسائل و مسائل کے ایک سوال کے جواب کا مطالعہ کریں جو قطبین کے مقامات کے متعلق پوچھا گیا ہے۔

وجن ممالک میں چوبیس گھنٹے کے اندر طلوع و غروب ہوتا ہے، ان میں خواہ دن اور رات چھوٹے ہوں یا بڑے نمازوں اور روزوں کے اوقات انہی قاعدوں پر مقرر کئے جائیں گے، جو قرآن و حدیث سے بتائے گئے ہیں۔ یعنی فجر کی نماز طلوع آفتاب سے پہلے، ظہر کی نماز زوال آفتاب کے بعد، عصر کی نماز غروب آفتاب سے قبل، مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد اور عشاء کی نماز کچھ گذرنے پر، اگر رات بہر حال صبح صادق کے ظہور پر شروع ہوگا اور غروب آفتاب کے بعد افطار کیا جائے گا۔ جہاں ظہر و عصر یا مغرب و عشاء میں فصل ممکن نہ ہو، وہاں جمع بین الصلوٰتین کر لیں۔

آپ کے صاحبزادے اپنی سہولت کے لئے انگلستان کی رصدگاہ سے

۴ ستارہ رہنما قرار دے کر جو ان کا براہ راست اوقات کی حیثیت رکھتے ہیں یا اس ذات سے وابستہ لوگوں سے

قبل اس کے کہ ہم مولانا مودودی کے صرف اقتباس سے غلط نتیجہ اخذ کرنے پر کچھ عرض کریں مناسب ہے کہ مدیر موصوف کو یہ بتاتے چلیں کہ کسی پر تبصرہ کرنے سے قبل کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ مبصر کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے دو بدو ہم اظہار خیال کر لیں۔ دوسرے تبصرہ کے وقت اس کی پوری تحریر سامنے ہونی چاہئے، ممکن ہے کہ اس نے اپنے نظریہ سے رجوع کیا ہو، اس کی تردید کی ہو یا کسی جگہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہو۔

مدیر موصوف نے مولانا مودودیؒ کے اقتباس سے غلط نتیجہ اخذ اس لئے کیا کہ ان کی دیگر تحریریں جو قطبین کے علاقوں سے متعلق ہیں ان کے سامنے نہیں تھیں۔ اگر تفہیم القرآن اور رسائل و مسائل موصوف کے سامنے ہوتیں تو وہ مولانا پر عدم واقفیت اور عدم توجہی کا الزام نہ لگاتے۔ اور نہ ہی مولانا کو اسکول طلبہ کی صف میں بٹھا دیتے۔ قطبین کے علاقوں کے سلسلے میں سورہ بقرہ کی آیت (۱۸۷) کی روشنی میں فرماتے ہیں۔

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل (بقرہ ۱۸۷)

اسلام نے اپنی عبادات کے لئے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے جس دنیا میں ہر وقت ہر مرتبہ تمدن کے لوگ ہر جگہ اوقات کی تعیین کر سکیں وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے ان آثار کے لحاظ سے وقت مقرر کرتا ہے۔ جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر نادان اس طریق توقیت پر عموماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قطبین کے قریب جہاں رات دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں اوقات کی تعیین کیسے چل سکے گی؟ حالانکہ یہ اعتراض دراصل علم جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے، حقیقت میں وہاں نہ چھ مہینوں کی رات ان معنوں میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن۔ جس معنی میں ہم خط استوا کے آس پاس رہنے والے لوگ رات

ماہر تصور کیا جاتا ہے کیا بتائیں گے کہ یہ کن لوگوں کا خیال ہے، کب کیا گیا؟ اور کس مقام پر کہا گیا؟ اگر یہ بات کسی نے مولانا کے متعلق کہی تو ہمیں اس سے اتفاق نہیں، بلکہ مولانا کے متعلق یہ کہنا بجا ہے اور یہی کہا بھی جاتا ہے کہ انھوں نے جدید مفکرین کا غیر معمولی مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے فلاسفہ کے افکار کے مطالعہ کے بعد جب قرآن کریم کا مطالعہ تو کتاب منزل کے بالمقابل ان کے افکار سطحی اور وہ خود بونے نظر آنے لگے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے مذہب اسلام کے مختلف پہلوؤں پر نہایت جدید اور اچھوتے انداز میں اظہار خیال کیا ہے، مولانا کا یہ انداز تحریر نئی نسل کے اذہان سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ بیسویں صدی پر ان کے لٹریچر کا غیر معمولی اثر ہے، ان کی تالیفات و تصنیفات کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جن سے بہت لوگوں کو اسلام کی نعمت نصیب ہوئی۔ مدیر موصوف نے مولانا پر عدم توجہی کا الزام لگاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ انھیں جدید ذہن کے مالک علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔ مدیر موصوف کے ذہن میں شاید یہ بات ہے کہ عصری علوم کے حاملین ہی جدید ذہن کے مالک ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کا یہی مفہوم ہے تو حقیقتاً اس معنی میں مولانا مودودیؒ جدید ذہن کے مالک نہیں ہیں۔ کیونکہ انھیں طبیعیات، علم الارض، کیمیا، علم نباتات اور علم حیوانات وغیرہ نہیں آتا۔ یعنی روشن خیالی اور جدت طرازی اب صرف عصری علوم کے حاملین کی جاگیر بن چکی ہے۔ وہ مولانا مودودیؒ کو جدید ذہن کا مالک اس حیثیت سے تسلیم کرتی ہے کہ جدید فلسفہ، جدید افکار و خیالات، اور جدید مفکرین کو سامنے رکھتے ہوئے مذہب اسلام کو جدید شکل و صورت میں پیش کیا ہے۔ جدید دور کے تقاضوں صنعتی عہد اور عصری حسیات سے بخوبی واقف تھے انھوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ "مکمل ضابطہ حیات" اور "اقامت دین" کی اصطلاح پر جس قدر مولانا نے لکھا ہے دور دور تک مثال نہیں

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

دریافت کرلیں کہ ان کے علاقے میں آفتاب کے طلوع و غروب اور زوال کے اوقات کیا ہیں؟ پھر ان اوقات کے لحاظ سے اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کرلیں۔

روزے کے لئے وہاں کے دن کی بڑائی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابن بطوطہ نے روس کے شہر بلغار کے متعلق لکھا ہے کہ گرمی کے زمانے میں جب وہ وہاں پہنچا ہے تو رمضان کا مہینہ تھا۔ اور افطار کے وقت سے لے کر صبح صادق کے طلوع تک صرف دو گھنٹے کا وقت ملتا تھا۔ اس مختصر مدت میں وہاں کے مسلمان افطار بھی کرتے، کھانا بھی کھاتے، اور عشاء کی نماز بھی پڑھ لیتے تھے۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر کچھ دیر نہ گذرتی تھی کہ صبح صادق ظاہر ہو جاتی اور پھر فجر کی نماز پڑھی جاتی تھی (رسائل و مسائل، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ بار سوم ۱۹۷۹ء ۴/۲۷۰-۲۷۱)

تفہیم القرآن اور رسائل و مسائل کی روشنی میں اب اس کا شائبہ باقی نہیں رہا کہ مولانا مودودیؒ قطبین کے مقامات سے عدم توجہی کا شکار تھے۔ لیکن حیف صد حیف کہ مدیر موصوف نے مولانا پر عدم واقفیت و عدم توجہی کا الزام لگا کر انھیں اسکول طلبہ کی صف میں لا کر کھڑا کیا ہے، یہ بات مدیر موصوف نے اس لئے کہا ہے کہ ان کے خیال میں بغیر سائنس مذہب کی اصل حقیقت سامنے آ ہی نہیں سکتی۔ علوم دینیہ کے حاملین کو دامے، درمے، سخنے سائنس پلانا چاہتے ہیں اور ایک حد تک مناسب اقدام ہے لیکن کیا ہی بہتر ہوتا کہ مسلمانوں کے اندر سائنسی بیداری لانے کے لئے مسلم تعلیمی اداروں پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی اور خود بھی مدیر موصوف عصری علوم کے حاملین کو لے کر مختلف دینی مدارس میں دینی تعلیم کے حصول کے لئے پابرکاب ہوتے۔ اس سے یہ ہوتا کہ سائنس داں طبقہ کے سامنے نماز و روزے کی اصلی روح سامنے آجاتی اور رمضان کے ماہ مقدس میں روزوں کا تقدس پامال نہ ہوتا۔ مدیر موصوف نے مولانا مودودیؒ کے متعلق فرمایا کہ انھیں عصری علوم کا بھی

اسلامی قانون جامد کیوں؟

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحبؒ

سوال: اسلام کا قانون جامد کیوں ہے؟ انسانوں کو قانون دینے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ انسانوں کا اپنا معاملہ ہے، جیسے چاہیں وہ قانون بنائیں۔

یہ بات تو دنیا کے تمام قانون دانوں اور دانشوروں کے نزدیک مسلّم ہے کہ قانون نافذ کرنے والے جج اور قاضی کو دیانت دار اور انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔ اس بات میں کسی بھی معقول شخص کو اختلاف نہیں ہے۔ اب اگر قانون کے نفاذ کے لئے دیانت داری اور غیر جانبداری اس قدر ضروری ہے تو پھر قانون سازی کے لئے دیانت داری اور غیر جانب داری بدرجہا ضروری ہونی چاہیئے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ افراد سے اور گروہوں سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ قانون سازی میں دیانت داری اور امانت داری اور غیر جانب داری کے تقاضے پوری طرح ملحوظ رکھیں گے۔ کون انسان ہے جو شخصی پسند و ناپسند اور طبقاتی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں سے بالاتر ہو۔

آج کے دور میں اسمبلیاں قانون سازی کرتی ہیں۔ اسمبلیوں میں کسی ایک سیاسی پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے۔ قانون درحقیقت وہ بناتی ہے۔ کیا سیاسی

پارٹی عصبیت سے بالاتر ہوتی ہے؟ بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ وہ پارٹی کے مقاصد پورے کرنے کے لئے قانون سازی کرتی ہے۔ اس کے لئے قانون سازی بھی حصول مقاصد میں ایک زینہ کا کام دیتی ہے۔ کیا یہ قانون دیانت داری اور امانت داری کے تقاضے پورے کرتا ہے؟

پھر انفرادی اور گروہی عصبیتوں سے بڑھ کر زمانی اور مکانی عصبیتیں بھی ہوتی ہیں۔ سارا خطہ ایک خاص قسم کی عصبیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ سارا دور ایک خاص قسم کی عصبیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ عصبیت ہمہ گیر نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے یورپ کے معاشرہ میں صدیوں تک عورتوں اور مردوں کے لئے مجرد رہنا، ازدواجی تعلق سے ناآشنا رہنا اعلیٰ تر کردار سمجھا جاتا رہا۔ کوئی فرد اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا تھا۔ آج متفقہ طور پر سب لوگ اس طرز عمل کو غلط اور برا سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس پورے دور کی عقلِ اجتماعی غلط کار تھی، حق سے ناآشنا تھی۔ ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت پر بیوی کو لاش کے ساتھ جل مرنا پڑتا تھا، ستی ہونا پڑتا تھا۔ کسی کو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ عورت پر کتنا صریح ظلم تھا۔ آج سارا ہندوستان اس فعل کو غلط قرار دیتا ہے۔ گویا صدیوں تک عقلِ انسانی غلط کاری میں سرگرداں رہی۔ مختلف قسم کی عصبیتیں عقلِ انسانی کی کارکردگی کو مجروح اور ناقص بناتی رہتی ہیں۔ انسان جب اپنی اس عقل کے ساتھ قانون سازی کرتا ہے تو نہ دیانت دار رہ سکتا ہے نہ امانت دار رہ سکتا ہے اور نہ غیر جانب دار۔ کسی بھی ملک کی قانون سازی کی تاریخ پڑھ لیجئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانی عقل کس کس طرح قلابازیاں کھاتی رہی ہے۔

مغربی ممالک کی فکری فضا میں سکۂ رائج الوقت ڈارونیت ہے جس میں ساری اہمیت بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کو حاصل ہے۔

جس میں طاقتور کو حق حاصل ہے کہ وہ کمزوروں کو دبائے، کچلے اور پیسے۔ انسانیت، شرافت اور اخلاق کا وہاں گزر نہیں۔ اسی نظریئے نے تقویت پاکر یورپ اور امریکہ نے ساری دنیا کو دبا رکھا ہے اور کچل رکھا ہے۔ اقوامِ متحدہ عدل و انصاف کا عالمی ادارہ ہے، وہاں جس طرح قانون سازی کی جاتی ہے اور پھر جس طرح اس کو نافذ کیا جاتا ہے، وہ ظاہر و باہر ہے۔ وہاں پانچ مقتدر ریاستیں ویٹو کے اختیارات کی حامل ہیں، ان کے خلاف داد رسی کا کوئی امکان نہیں۔ وہ گویا گناہ سے پاک اور غلطی سے مبرا ہیں۔ دوسرے درجے پر اینگلو سیکسن اقوام کا دائرہ ہے۔ ان کا مرتبہ بھی بلند و بالا ہے۔ ان کے حقوق بھی وہاں محفوظ ہیں۔ پھر ایشیا اور افریقہ کی رنگ دار اقوام ہیں۔ ان کو دبایا، کچلا اور پیسا جا سکتا ہے اور عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے۔ سیاسی طور پر وہ سفید فام اقوام کے خصوصاً دو بڑی طاقتوں کے آگے دست نگر ہیں اور معاشی طور پر بھی ان کے آگے دست نگر ہیں۔ یہ سب ہے انسانوں کے عالمی ادارہ کی قانون سازی اور قانون کی تعمیل، کیا وہاں انصاف ہے؟ عدل ہے؟ کیا وہاں مساوات ہے؟ کیا دیانت ہے؟ کیا جانبداری نہیں ہے؟

ڈارونیت کی قائل مغربی اقوام کو اس ظلم و ستم پر کوئی تشویش نہیں۔ ان کے نزدیک قانونِ فطرت یہی ہے۔ انہیں اس چوٹ کی کسک محسوس نہیں ہوتی جو کمزور افراد اور کمزور اقوام ان کے ہاتھوں سہتی رہتی ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی ان کے یہاں یقینی نہیں۔ آخرت میں اعمال کی جواب دہی پر ان کا ایمان نہیں۔ تنازع للبقا کے قانون پر ان کا عمل ہے، اس سے آگے ان کی پرواز نہیں۔

زندگی کا تصور ایک مسلمان کے نزدیک ہرگز یہ نہیں ہے۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے پیدا کی ہے، دنیا کی نعمتوں پر سب کا حق ہے، سارے انسان آزاد ہیں۔ علم، ارادہ، اختیار، تصرف کی قوتوں سے بہرہ ور ہیں۔ یہ نعمتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ بہتر سے بہتر اعمال کا مظاہرہ کریں۔ سارے انسان دنیا کی زندگی میں درحقیقت ایک امتحان دے رہے ہیں۔ یہ نعمتیں اسباب و وسائل ہیں امتحان کے، تاکہ وہ امتحان کا پرچہ (نامۂ اعمال) بہتر سے بہتر طور پر حل کریں۔ مرنے کے بعد

دوسری دنیا میں اس کا نتیجہ برآمد ہوگا، پھر یا ترقی (PROMOTION) یا تنزل (DEMOTION)

اس حقیقت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ چند چالاک اور شاطر افراد انسانوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا لیں۔ امتحان دینے میں مانع آئیں۔ امتحان میں خلل ڈالیں۔ لوگوں کو دبائیں، کچلیں اور پیسیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قانون سازی کا حق اصولی طور پر انسانوں کو نہیں دیا۔ بلکہ اپنے پاس رکھا ہے اور اس نے نہیں دیا کہ انسان من مانی کر کے دوسرے انسانوں کو دبائے، کچلے اور پیسے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ	خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی
تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ	کا حکم ہے۔ اللہ بڑا بابرکت ہے،
(الاعراف ۵۴)	سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

اس آیت میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں، غور کرنے کے قابل ہیں:

۱ — جس ہستی نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے، جس کی نظر تمام انسانوں کی احتیاجوں، تقاضوں اور مطالبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کے لئے قانون بنائے، وہ حکم نافذ کرے۔ وہ سارے انسانوں کے فائدے کے لئے ہوگا۔ تنگ نظر، تنگ دل انسان اس منصبِ عظیم کا اہل نہیں ہے۔

۲ — وہ ہستی تمام انسانوں کی ساری صلاحیتوں کو پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ وہ اعمال و کردار، تہذیب و اخلاق، تمدن و معاشرت ہر پہلو سے انسانوں کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ وہ انسانوں کو برکت دینا چاہتی ہے۔ اس لئے قانون سازی وہ زیادہ اہل ہے، نہ کہ تنگ نظر، تنگ دل اور خود غرض انسان۔

۳ — وہ ہستی تمام انسانوں کی پرورش کرنے والی ہے۔ وہ انسانی مفادات — انفرادی، اجتماعی اور قومی — کو بہتر طریقے پر سمجھتی ہے اور پورا کرتی ہے اس لئے قانون سازی کی وہ زیادہ اہل ہے، نہ کہ تنگ نظر، تنگ دل اور خود غرض انسان۔

یہاں تک اصولی بحث ہو رہی تھی کہ قانون سازی کا اہل انسان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا دائرہ کار ہے۔ آگے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ قانون سازی کس طرح کی ہے۔ اسلامی شریعت: اسلامی قانون دو اجزا پر مشتمل ہے: ایک حصہ دائمی ہے، مستقل ہے (RIGID) اور دوسرا تغیر پذیر ہے۔ — (FLXIBLE) قانون کا دائمی اور مستقل حصہ — جس کو معترض نے جامد کا نام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو وجہ سے دیا ہے۔

آج کی دنیا میں تغیر اور تبدل کا بڑا غلغلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر شے متغیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی انسان چاند پر جا پہنچا اور ہم ابھی تک زمین پر ہی پڑے ہیں۔ بلاشک وشبہ انسانی معاشرہ میں تغیرات آتے ہیں، تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرتا۔ مگر کوئی مرد فہیم اس بات پر بھی تو غور کرے کہ تغیرات کن پہلوؤں میں آتے ہیں اور کس درجہ میں آتے ہیں۔ کیا سارا انسانی وجود تبدیل ہو گیا؟ نہیں ایسا نہیں ہے، انسانوں کی جسمانی ساخت بدستور وہی ہے۔ آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؛ آج سے ہزاروں سال پہلے جو جسمانی ساخت تھی وہ آج بھی موجود ہے۔ کیا جسم کے مطالبات میں تغیر آگیا؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ کھانے، آرام کرنے، جنسی خواہش رکھنے کی جبلتیں، (INSTINCTS) وہی ہیں، جو قدیم انسان میں تھیں؛ کیا جذبات و عواطف میں تبدیلی آگئی ہے؟ ایسا بھی نہیں ہے، ایثار، ہمدردی، پیار و محبت، نفرت و عداوت، بغض و کینہ، عداوت کے جذبات اور باطنی کیفیات بھی وہی ہیں جو قدیم انسان میں تھیں۔ حسنِ اخلاق، حسنِ اعمال اور حسنِ کردار کے معیار آج بھی وہی ہیں جو قدیم انسان میں تھے۔ پہلے بھی بعض افعال مذموم اور جرائم شمار کئے جاتے تھے؛ آج بھی ان کو مذموم اور جرائم شمار کئے جاتے تھے۔ آج بھی ان کو مذموم اور جرائم سمجھا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان وہی ہے جو قدیم زمانہ میں تھا۔

تغیر جو کچھ آیا ہے وہ انسان کی ذات میں نہیں آیا ہے، انسان کی فطرت میں

نہیں آیا ہے، بلکہ انسان کے تمدن میں آیا ہے۔ انسان کے داخل میں نہیں آیا ہے، انسان کے خارج میں آیا ہے۔ آدم کے بیٹے پتھروں سے یا ڈنڈوں سے لڑتے ہوں گے آج ہم بموں اور میزائلوں سے لڑتے ہیں۔ آدم کے بیٹوں نے پتوں سے ستر ڈھانکا ہوگا، ہم نفیس کپڑے پہنتے ہیں۔ آدم کے بیٹے غاروں میں یا درخت کے نیچے آرام کرتے ہوں گے، ہم کوٹھیوں یا بنگلوں میں رہتے ہیں۔ ظاہر میں تغیرات آئے ہیں، بہت زیادہ تغیرات آئے ہیں، لیکن باطن میں وہی قدیم انسان موجود ہے۔ اس میں کوئی تغیر نہیں آیا۔

قانون سازی انسان کے لئے ہوتی ہے، اس کی ذات کے لئے ہوتی ہے، اس کے باطن کے لئے ہوتی ہے۔ جب ذات دائمی ہے، مستقل ہے تو پھر قانون کیوں نہ دائمی ہو اور مستقل ہو۔ اس لئے انسان کی فطرت سے واقف اللہ تعالیٰ نے جو قانون دیا ہے وہ دائمی کیوں نہ ہو۔ وہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لئے کیوں نہ ہو، اس لئے قانونِ خداوندی (شریعتِ اسلامی) کو دائمی اور ابدی ہونے میں کون سی شے مانع ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کا عین تقاضہ ہے کہ قانون دائمی ہو۔

عقل انسانی — انفرادی سطح ہو یا اجتماعی سطح — تلوّن مزاجی، عصبیت اور اغراض پرستی اور پرواز کی نارسائی کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کی نظر ہمیشہ وقتی اور ہنگامی مسائل کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم کی قانون سازی ہر دم متغیر رہتی ہے۔ جب تک فرد کی احتیاجات، تقاضے اور امنگیں، انسانی معاشرہ کے تقاضے اور مطالبات اور نوع کی طلب انتہائے مقصود پیشِ نظر ہو انسان سے ایک گروہ اور ایک خطے کے لئے بھی قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ کسی انسانی عقل و فہم کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ وہ انفرادی، اجتماعی اور نوعی مطالبات کا حال اور استقبال میں تصور بھی قائم کر سکے، احاطہ کرنا تو بڑی بات ہے۔ اس لئے قانون سازی انسانی دائرہ فہم سے ہی باہر ہے۔

دنیا میں انسان کی زندگی صلاحیتوں اور استعدادوں کی آزمائش گاہ ہے۔

انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ علم، عقل، ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی گئی ہے، تمام مخلوقات — جمادات، نباتات، حیوانات — کے مقابلہ میں انسان آزاد ہے۔ جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے۔ اسی آزادی میں اس کی آزمائش ہے کہ وہ راست روی اختیار کرتا ہے یا بدراہی اختیار کرتا ہے۔ ایک ایک لمحہ جو انسان کا دنیا میں گزر رہا ہے اس میں اس کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس کا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ ویڈیو فلم تیار ہو رہی ہے۔ اس امتحان کے لئے انسان کے لئے پرامن اور ماحول اور سازگار معاشرہ درکار ہے تاکہ سب انسان حسب حیثیت امتحان دیں، کوئی شخص خلل انداز نہ ہو۔ اپنا نامۂ اعمال بہتر سے بہتر بنائیں۔

انسانی معاشرہ میں امن اور سازگاری پیدا کرنے کے لئے کون سے امور ضروری اور لازمی ہیں۔ یہ انسان اپنی تلون مزاجی کے تحت معلوم نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون سازی اپنی جانب سے کر دی ہے۔ ان کو حدود اللہ اور نص صریح کہتے ہیں۔ حدود اللہ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان ایک دائرہ میں اپنے اختیارات استعمال کرے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے۔ دوسروں کو بھی زندگی گذارنے کا حق دینا چاہئے۔

خلافت کے امتحان میں بیٹھنے والے ہر فرد کو ذات کا تحفظ حاصل ہونا چاہئے ورنہ وہ امتحان کیسے دے سکتا ہے۔ اس لئے اسلام نے قتل کو سنگین جرم قرار دیا اور مجرم کو ایسی ہی سنگین سزا کا مستحق قرار دیا۔

جو لوگ اس سنگین سزا کی مخالفت کرتے ہیں، وہ دراصل موت کے بعد کی زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ بس یہی زندگی ہے، اس لئے جو مقتول ہے وہ تو مر گیا اور اب جو زندہ ہے (قاتل) وہ تو زندگی سے محروم نہ رہے، لطف اٹھائے۔ یہ خالص مادی اور حیوانی نقطۂ نظر ہے۔ زنا اسلام کے نزدیک سنگین جرم ہے، وہ اس کے لئے بھی سنگین سزا دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ خلافت کے امتحان کے نقطۂ نظر سے امتحان جاری رکھنے کے لئے انسانوں کی آمد کا تسلسل جاری رہنا چاہیے۔ انسانی بچہ جانوروں کے بچوں کے برخلاف بلوغ تک والدین کی نگرانی اور شفقت میں رہتا ہے۔ بڑی مدت کے بعد بالغ ہوتا ہے۔ اس کی تربیت کے لئے خاندان کا وجود ضروری ہے۔ جہاں سے تربیت پا کر نووارد زندگی کے امتحان میں داخل ہوتے ہیں اور اپنا پرچہ دیتے ہیں۔ اپنا نامۂ اعمال تیار کرتے ہیں۔ زناکاری اس سارے سلسلہ کو نظر انداز کرنے بلکہ ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ وہ صرف جانوروں کی سطح پر ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا نام ہے۔ بعد کے اثرات اور نتائج سے وہ بے تعلق ہے۔ ایک مسلمان جس کے نزدیک آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اور یہ دنیا کی زندگی تیاری کی زندگی ہے وہ کیسے اس ساری اسکیم کو تلپٹ ہوتے برداشت کرے۔ اسی طرح قتل، زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا تعلق انسان کے بنیادی تصورات اور انسان کی بنیادی اسکیم سے ہے۔ فرد کو تحفظ دینے کے لئے اسلام نے ان سنگین سزاؤں کا انتظام کیا ہے۔ ان سزاؤں کو اللہ تعالیٰ نے خود نافذ کر دیا تاکہ انسانی عقل اپنی "تلون مزاجی" سے اس میں مداخلت نہ کرے۔ یہ سزائیں مقدس بن جائیں۔

انسانی عقل کی تلون مزاجی کا یہ حال ہے کہ ایک جانب اٹلی میں اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں سرے سے قتل کی سزا ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف جنوبی امریکہ میں ایک گورے کے بدلے میں دو اور تین کالے قتل کئے جاتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ امریکہ میں کالوں کو سنگسار (LYNCHING) کرنے کا حق عوام گوروں کو حاصل تھا۔ حدود اللہ اس "تلون مزاجی" کا علاج ہے۔

اسلامی قانون کا دوسرا حصہ قابل تغیر ہے۔ تمدنی حالات میں تغیر آتا رہتا ہے۔ معیشت و معاشرت میں تغیرات آتے رہتے ہیں، جن کے باعث انسان کے اوضاع و اطوار میں بھی تغیرات آ جاتے ہیں۔ اس لئے تغیر پذیر حالات سے مطابقت ضروری ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اہل علم پر اجتہاد کا دروازہ کھول دیا ہے

ان اجتہاد کے لیے چند شرائط ہیں :-

۱ ـــــ حدود اللہ اور نص صریح کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔ یہ اجتہاد قرآن و سنت کے دائرہ میں رہ کر ہوگا، اس قانون سازی میں انسان بنیادی قانون کا پابند ہوگا۔ مطلق العنان، شتر بے مہار اور فیل بے زنجیر نہیں ہو سکتا۔

۲ ـــــ اس اجتہاد میں انسان کی بنیادی اسکیم ـــــ انسان کا خلیفۃ اللہ ہونا، دنیاوی زندگی ایک امتحان ہونا ـــــ کو پیش نظر رکھا جائے۔

۳ ـــــ آخرت میں اعمال کی جواب دہی کا تصور ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔

۴ ـــــ علم و فضل اور تقویٰ کے لحاظ سے جو لوگ اہل ہیں بس وہی اجتہاد کر سکتے ہیں۔ موجودہ قوانین میں ایک حصہ تو قاعدہ و ضوابط کا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں قانون نہیں ہے، بلکہ معاملات کو سہولت سے سرانجام دینے کے لئے طریقۂ کار ہے۔ اس میں جو بہترین طریقہ ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔

اس طرح اسلامی قانون، اسلامی شریعت دائمی ([illegible]) اور تغیر پذیر (FLEXIBLE) دونوں حصوں کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے اسلامی قانون انسانی فطرت کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ اسی لئے یہ ہر زمان اور مکان کے لئے موزوں ہے۔

بشکریہ : "ترجمان القرآن" لاہور

بقیہ :- خواندگی کا مسئلہ اسلامی تناظر میں

ممکن ہے اور یہ کس پر عیاں نہیں کہ عورتوں میں خواندگی کے مثبت نتائج اولاد کی بہتر تربیت اور خود پرداخت کی شکل میں قوم کا سرمایہ بن سکتے ہیں۔

بشکریہ : "فکر و نظر"

یہ کون صاحب ہیں ؟

کئی ماہ پہلے منی آرڈر سے ایک رقم آئی ہے۔ کوپن پر صرف محمد الیاس [illegible] لکھا ہوا ہے۔ یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا مکمل پتہ چاہیئے۔ (ادارہ)

محمد ادریس فلاحی — ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

ہندوستان میں فرقہ پرستی کے اسباب

اور اس کا حل

صورت حال | ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم ۴۱)

ترجمہ :- خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آ جائیں ... ...

پوری انسانیت کا وجود اور اس کی ترقی جن فطری اصول بنیادوں پر ہوتی ہے اگر ان کا پاس و لحاظ نہ کیا جائے تو تاریخ شاہد ہے کہ اس کے نتیجہ میں انسانوں کو ذلت و رسوائی اٹھانا پڑی ہے وہ بھی ایسی سبق آموز ذلت و رسوائی کہ انسانوں کا دوبارہ اٹھنا اور سر اٹھانے کے طریقے سے زندگیاں گذارنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ بلکہ روحانی، مادی اور سیاسی اعتبار سے دوسری قوم کے دست نگر رہنے کے لئے مجبور و بے بس اور نامعلوم مدت تک ملامتوں اور بدگمانیوں کا شکار رہے ہیں۔

تقریباً یہی حال اس وقت ہندوستان کے باشندوں کا بالعموم اور مسلمانوں کا بالخصوص ہے۔ ایک دور وہ تھا کہ پورے ملک پر انگریزی حکومت کا غلبہ تھا کسی کو نہ لکھنے اور اظہار خیال کی اجازت تھی۔ ذہنی و فکری مادی و سیاسی اعتبار سے

رنگ غلام اور محکوم تھے۔ ایک دور یہ ہے کہ ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوری حکومت تسلیم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر ایک کو بولنے لکھنے اور تنقید کرنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے لیکن ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کو ۱۹۴۷ء سے اظہار خیال اور تنقید و تبصرہ کی آزادی نہیں بلکہ باضابطہ خون خرابا، توپ و تفنگ اور فساد فی الارض کی آزادی ملی تھی   اس وقت سے لے کر اس وقت تک انسانی جانی و مالی اور عزت و ناموس کا جس قدر سستا پن ہوا ہے ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی نظیر مل سکے گویا یہاں کے انسانوں نے اپنی فطرت بنالی ہے کہ مادی مفادات کے حصول کی جنگ و دو میں خود انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اسے زمین پر باقی رہنے دیا جائے بلکہ اسے قربانی کا بکرا سمجھ کر جہاں اور جس چوراہے پر چاہیں ذبح کر دینا ان کے لئے محض معمولی بات ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ معصوم انسانوں کو جس طرح بے دریغ گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا ہے، اور ان سے انسانی قلوب و اذہان اتنے عادی اور مانوس ہو چکے ہیں کہ سیکڑوں کی تعداد میں کٹے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر راہ کی کیا بات ماتھے پر شکن تک نہیں آتی   جس کا نتیجہ یہ ہے اب انسان کے اندر سے خود انسان کی عزت و احترام کا جذبہ ناپید ہو رہا ہے بغض و کینہ   اور نفرت و عداوت کا ماحول بن رہا ہے قوم قوم سے ٹکرا رہی ہے اس لئے کہ اس کے پیش نظر کچھ مفادات ہیں جنہیں وہ حاصل کرنا ہے۔ ایک خاندان یا قبیلہ کی ثقافت اس سے ٹکرا رہا ہے کہ کہیں سیاست و معیشت، دولت و ثروت اور عزت و جاہ میں آگے نہ بڑھ جائے   مختصر یہ کہ بابرہ تیش کوشی کہ عالم دوبارہ نیست، اب تو آرام سے گذرتی ہے آخرت کی خبر خدا جانے۔

مختلف اقوام و قبائل کی حکمت و مصلحت

انسانوں کو مختلف قبائل، مختلف اقوام اور مختلف نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے اندر خاص فطری حکمت و مصلحت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

(حجرات ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری (مختلف) قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو خدا کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے یقیناً اللہ تعالیٰ علیم خبیر ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی شکلوں ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا تاکہ لوگ ایک دوسرے کی شناخت کر سکیں اسی طرح ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ کسی خاندان یا قبیلہ کو کسی پر فوقیت و برتری حاصل نہیں ہے۔ البتہ وہ شخص معزز و مکرم ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں خدا نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے اہم اصول کی رہنمائی فرمائی ہے چنانچہ مولانا مودودیؒ نے مذکورہ آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ص۱ "اس آیت میں پوری نوع انسانی کو خطاب کر کے اس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے۔ یعنی نسل رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے اور کہیں ایک

ص۱ تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۹۵

جغرافی خطے میں ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا۔ پھر ان بنیادوں پر اعلیٰ اور کمتر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں، مذہب ایجاد کیے گئے ہیں، قوانین بنائے گئے ہیں، اخلاقی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھہرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھہرائے گئے اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا و افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تہ میں بھی یہی تصور کارفرما رہا ہے کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو ان پر مباح ہے۔ اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لوٹیں، غلام بنائیں اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ ان سب چیزوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں انسانوں کی تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تم

سب کی اصل ایک ہے۔ ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اس تفرقے اور اونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندان سے قبائل اور اقوام وجود میں آ جائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خدوخال، زبانیں اور طرز بود و باند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے۔ اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں۔ تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں۔

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی ہے جس میں رنگ و نسل، زبان و وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں۔ جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں۔ جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

ہندو مسلم اختلاف کیوں؟ | ہندو مسلم اختلاف، ایک طویل داستان کا خلاصہ

ہے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ انگریزوں نے چھوت کا بیج بویا جس کی فصل ہم کاٹ رہے ہیں لیکن انگریزوں کے زمانے میں اتنی خونریزی اور قتل وغارت گری نہیں ہوئی جتنی آزادی کے بعد ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے اور نہ جانے کب تک ہوگی۔ دراصل ہندو مسلم اختلافات کی ابتدا انگریز مورخ کی غلط بیانی سے ہوئی جس نے تاریخ کے صفحات کو مسخ کیا کہ مسلم حکمراں ظالم وجابر اور کینہ پرور تھے۔ لیکن ترقی و انصاف پسند مورخین نے اس گرد کو صاف کیا۔ گزشتہ ریکارڈ کو درست کرنے کی کوشش کی۔ افراد خاموش رہ سکتے ہیں لیکن تاریخ تو خاموش نہیں رہ سکتی اس کا فیصلہ تو سب کو خاموشی سے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسی لئے مسلم حکمرانوں کے متعلق جو الزامات لگائے جا رہے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔

دوسرا معاملہ تقسیم ہے یہ سمجھا گیا کہ دو اور الگ فرقین ٹکڑے مسلمانوں نے کرا دئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کرنے والے ہندو مسلمان دونوں تھے پچاس سال پہلے کی تاریخ ہے اس میں اتنی تبدیلی ہو سکتی ہے تو کئی سو سال کی تاریخ میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہوئی ہوں گی۔ ایک ہم ہی کر لیا اچھی ہی صورت کو بگاڑ کے وہ ہیں جن میں تصویر بنائی آتی ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کثیر ہے۔ بے روزگاری عام ہوتی تو تعلقات بہتر ہوتے۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ہمارے لئے انتقامات کے سارے دروازے بند کر دئے گئے ہیں اس لئے وہ کنارہ کشی اختیار کرتے چلے گئے۔ اس کو غلط سمجھا گیا کہ یہ ملک کی یکجہتی سے دور اور الگ رہنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب قوم پرستی کی لعنت ہے جس کا اصول یہ ہے کہ میری قوم حق پر ہو یا باطل پر مجھے اس کا ساتھ دینا چاہئے۔ ہندو ہر برائی میں ہندو کے ساتھ ہے۔ اور کسی اچھائی میں بھی مسلمان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح مسلمان مسلمان کی

ہر برائی پر عش عش کرتا ہے اور ہندوؤں کی کسی اچھائی کو اچھائی ماننے کی اخلاقی جرأت اس میں نہیں رہی۔ یہ بات صرف عوام ہی میں نہیں بڑے لوگوں میں عوام سے بڑھ چڑھ کر پائی جاتی ہے۔ بلکہ عوام میں اسے پھیلانے کی ذمہ داری تو خود بڑے لوگوں کے سر عائد ہوتی ہے۔ وہ بڑے لوگ ہمارے لیڈر اور اخبار نویس ہیں جو عوام کی غلطیوں کے سب سے بڑے حصہ دار ہیں۔

ہر لیڈر رات دن اس فکر میں سرمست رہتا ہے کہ کسی طرح وہ اپنی قوم کو دوسری قوم پر غالب کرے جیسے اپنی قوم کے جذبات کو بھڑکا سکے اور کیسے دوسری قوم کے جذبات کو کچل ڈالے دونوں قوموں کے سپہ سالار بھی ہم جیسے پیچ کہتے ہیں اور یہی کرتے ہیں۔ ہندو لیڈر ہندوؤں کو اکساتا ہے۔ مسلمان لیڈر مسلمانوں کو بھڑکاتا ہے۔

پانچواں سبب اخبار نویسوں کی غلط بیانی ہے ان لیڈروں سے بڑھ کر ان مصیبتوں کے ذمہ دار ہیں جو قوم پرستی کے فیض سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ اخبار نویس کا اصول قوم پرستانہ فضا میں وہ نہیں رہ سکتا کہ نیکی اور انصاف اور راستی کو پھیلاتا ہے اور بدی، ظلم اور جھوٹ کو روکتا ہے بلکہ یہاں ہر ہندو اخبار کا اصول یہ ہے کہ ہندو کا ساتھ دیتا ہے اور ہر مسلمان اخبار نویس کا دین یہ ہے کہ مسلمان کی پیٹھ ٹھونکنی ہے۔ ہر اخبار کی نگاہ میں قدر و قیمت اس سچ کے لئے نہیں ہے جس سے اس کی قوم کو نقصان پہونچتا ہو بلکہ اس جھوٹ کے لئے ہے جس سے اس کی قوم کو فائدہ پہونچتا ہو۔

ہر اخبار کے مذہب میں نیکی کی تعریف یہ ہے کہ اپنے جتھے کی بھلائی خوب پھیلے اور دوسرے جتھے کی بھلائی کا راستہ روکا جائے۔

کوئی اخبار اٹھا لیجئے کسی بھی واقعہ کے بارے میں وہ لازماً تھوڑا بہت جھوٹ ضرور ایسا بولے گا جس سے اس کی اپنی قوم کے کسی عیب کی پردہ پوشی ہو سکے

یا دوسروں کے سر الزام ڈالا جا سکے۔ ہمارے یہ قلمی لیڈر چاہے بظاہر آپ کو شریف بنے دفتروں میں بیٹھے نظر آئیں مگر حقیقت یہ ہے کہ فساد زدہ علاقوں میں لوگوں کی جانوں اور مالوں اور آبروؤں کو برباد کرنے والے یہی لوگ تھے۔ ہر چھری ان ہی نے چلائی۔ ہر آگ ان ہی نے لگائی، ہر مکان ان ہی نے گرایا، ہر عصمت پر ان ہی نے حملہ کیا ہے۔ ان ہی کے قلم تھے جو میدان میں جاکر چھری بن گئے۔ ان ہی کے الفاظ تھے جو میدان میں جاکر فساد کرنے کے لئے غنڈوں کے روپ میں نمودار ہوئے ان ہی کی دواتوں کی روشنائی نے خون کی ندیوں کی شکل اختیار کی۔

چھٹا سبب مادیت کا رجحان ہے

جو قوم پرستی کی نشو ونما کا ذریعہ ہے، اور جو انسانوں کو اخلاقی بلندیوں سے نیچے کی طرف لانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہ انسان کو مادی انسان بنا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محض مادی فائدہ زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ روپیہ، پیسہ اور دولت، نوکری، عہدہ اور حکومت کے لئے آدمی ہر وہ حرکت کر بیٹھتا ہے جو انسانیت کے مزاج کے خلاف ہو۔ مادی جنگ کے مقاصد کے حصول میں بڑے سے بڑا سہاتما اور بڑے سے بڑا قائد اور منددر کا بڑے سے بڑا سیوک اور مسجد کا بڑے سے بڑا خادم سب کے سب چاہے کتنی ہی خوش نما روپوں میں جلوہ گر ہوں، اپنے اخلاق تباہ کرکے فسادی اور شر انگیز بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ مادی مقاصد کی سیاست کا ہر سپاہی لازماً انسانیت کا ایک دشمن بن کے رہتا ہے۔ خود شرارت کرتا ہے اور دوسروں کو شرارت کا سبق دیتا ہے خود فسادی ہوتا ہے اور دوسروں کو فسادی بناتا ہے، اور فساد کی تعلیم دیتا ہے۔ خود بے اخلاق ہوتا ہے اور دوسروں کو بے اخلاقی کا درس دیتا ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی علوم کی ڈگریاں لئے چکا ہو۔ سیدھی بات یہ ہے کہ دو ہی راستے ہیں یا تو انسان روپئے اور روٹی کے لئے قربان ہوگا اور اخلاق، سیاسی و معاشی فائدہ کے لئے لٹائے جائیں گے۔ یا پھر یہ کہ

انسان پر روپیہ اور روٹی کو قربان کیا جائے گا۔ اور اخلاق کی خاطر قوم کی سیاسی اور معاشی خواہشوں کو مٹایا جائے گا۔

ساتواں سبب الحاد و دھریت ہے

اسی الحاد و دھریت کا نتیجہ ہے کہ انسان مادہ پرستی یا دنیا کی غلامی روپئے اور روٹی کی پوجا اور دنیا کو لاوارث سمجھ کر اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھتا ہے، الحاد کے اس فلسفے کو جس قوم اور جس شخص یا گروہ نے قبول کیا اس سے دنیا کو امن وانصاف کی آس نہ رکھنی چاہئے۔ پھر تو وہ بس خونی انقلابوں اور تباہ کن جنگوں اور بین الاقوامی شرارتوں کے تحفے دے اور لے سکتا ہے۔ ہندوستان کی دونوں قوموں نے اس فلسفہ پر اپنے عمل کی بنیادیں اٹھائی ہیں، اگرچہ کچھ "قدامت پسند" دونوں کے اندر ایسے بھی مل سکتے ہیں۔ جو خدا کا نام بھی لیتے ہیں۔ دین و دھرم پر بات چیت بھی کر لیتے ہیں مگر سیاست میں اور قوم کے سارے قومی کاروبار میں وہ خدا کو بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے بلکہ خود اپنے خدا ہیں اور نفع اور فائدہ ان کا خدا ہے۔

کسی سماج میں مختلف فرقوں کا ہونا بالکل فطری ہے، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے، ہمارے موجودہ سماج کی اصل برائی خود فرقوں کی موجودگی نہیں بلکہ مختلف فرقوں کے درمیان تحمل کی غیر موجودگی ہے، فرقہ واریت کا مسئلہ عدم تحمل کا پیدا کردہ ہے نہ کہ خود فرقوں کی موجودگی کا پیدا کردہ۔

یہ ہیں وہ اسباب جن سے فرقہ پرستی اور ہندو مسلم اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم اختلافات وافتراق کی دوسری وجہ موجودہ ہندوستان کی صورت حال میں "بابری مسجد" ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ انسانوں کی جانیں گئی ہیں۔ اب بھی یہی صورت حال رہی تو یہ ہندوستان انسانیت کدہ بننے کی بجائے حیوانیت کدہ بن جائے گا۔ ... ... لوگ اپنی آئندہ نسلوں کو راست بازی کا درس دینے کی بجائے دغابازی کا درس دیں گے۔

مسلمانوں کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہندوستان میں ان کی پوزیشن "دعوتِ امت" کی پوزیشن ہے، ہم ہر اس کام کو چھوڑ دیں گے جس سے ہماری داعیانہ پوزیشن مجروح ہوتی ہے، ہم کو یہیں رہنا ہے اور غیر مسلموں ہی میں کام کرنا ہے، ہم کو چاہیے کہ اپنی پوزیشن ان کے سامنے واضح کریں، ہم ان کو سمجھائیں کہ ہم کیسے لوگ ہیں اور دنیا میں ہم کس پیغام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، اشتعال انگیز تقریر و تحریر ہم چھوڑ دیں۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کا درس دیں، انسان بن کر رہنے کی تاکید کریں۔

حل

چونکہ انسان کا انسان پر سب سے اولین حق یہ ہے کہ اس کے خون اور عزت و آبرو کا احترام کرے، یہ نہ صرف عقل کا مطالبہ ہے بلکہ خود قرآن مجید میں اس کی صراحت بایں الفاظ موجود ہے۔

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا" (سورۃ مائدہ ۳۲)

....

....

جو شخص کسی کو (ناحق) قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا اور جو شخص زندگانی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا باعث ہوا۔

اس لئے احترام نفس انسانی لوگوں میں تعلیم عام کی جائے جس کا تصور تقریباً ہر مذہب میں موجود ہے، سب لوگ خدا کے بندے بن کر رہیں اور اس کے حکموں پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں۔ اعلیٰ اخلاق کا پھیلانا سب کا مشترکہ پروگرام ہو۔ انسان کا احترام کرنا سب کا مانا ہوا اصول ہو، شرارت و بدی کو روکنا اور شرافت اور نیکی کو عام کرنا سب کا نصب العین ہو۔

قومی اتحاد اور قومی یکجہتی کا لفظ تو اس ملک میں پچھلی نصف صدی سے بولا

جا رہا ہے، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی حقیقی کام مطلق نہیں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کانفرنس کرنا، نعرہ بازی کرنا، یا پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر مارچ کرنا وہ کام نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو۔ اس کام کے لئے شعور و عقل کی تربیت کی ایک طویل اور مسلسل مہم درکار ہے، مگر قومی اتحاد کا نعرہ لگانے والوں میں سے کوئی بھی اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لئے فارغ نہ کر سکا۔

یہ حقیقت ہے کہ صحافت اس ذہنی انقلاب کو لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اخبار یا رسالہ باستثنائے چند ایسا نہیں جو اس مقصد کے لئے وقف ہو، ہمارے تمام اخبار حقیقت میں سیاسی اخبار ہیں، اس کے علاوہ جو ہفت روزہ سہ روزہ اور پندرہ روزہ یا ماہنامے ہیں وہ سنسنی خیز مضامین چھاپ کر سستی تجارت کرنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ شعور سازی کے اداروں کا جب یہ حال ہو تو وقتی جلسے جاری کرنے سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اخبار نویس کی ذمہ داریاں

اخبار نویس کی درج ذیل ذمہ داریاں ہیں۔
(۱) کوئی منافرت انگیز بیان شائع نہ کرے (۲) کسی واقعہ کی مبالغہ آمیز خبر شائع نہ کرے بلکہ اتنا ہی حصہ بیان کرے جس کی سچائی کا اسے یقین ہو اور جہاں اس کی تردید میں کوئی چیز ملے یا ترمیم کی ضرورت ہو تو فوراً اس کے لئے تیار ہو (۳) طرفداری سے پرہیز کرے (۴) واقعات کے تعلق سے غلط اعداد و شمار سے احتراز کرے (۵) اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ خبریں نہ شائع کرے اور نہ اشتعال انگیز زبان میں نوٹ لکھے جائیں۔ (۶) امن و سکون کو برباد کرنے والے جلسوں، جلوسوں، کانفرنسوں، تقریروں اور بیانات کا چرچا نہ کرے اور نہ ان کے ذمہ داروں کو اچھالا جائے (۷) ہر اخبار نویس کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم کے جرم کا تعین کرے جو اس نے فساد کے تعلق سے انجام دیا،

ہے۔ اور اپنے سامنے لیڈروں کے کارناموں پر بے جھجک اور بے لاگ تبصرہ کرے۔

ہندو مسلم عوام کی ذمہ داریاں

ہر قسم کے جھگڑا اور فساد میں شریک ہونے اور ساتھ دینے سے کلی انکار کریں۔ وہ صرف نیکی کا ساتھ دیں، چاہے وہ ہندو میں پائی جائے یا مسلمان میں اور وہ بدکاری و فحاشی کے دشمن ہوں۔ چاہے وہ ان کی اپنی قوم میں ہو یا دوسری قوم میں (۲) وہ ایسے جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں میں شریک نہ ہوں جن کا مقصد اشتعال پھیلانا اور فساد بھڑکانا ہو (۳) وہ ایسی سنسنی خیز تقریریں سننے اور اشتعال انگیز سرخیوں پر مشتمل مضامین پڑھنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں (۴) وہ اپنے لیڈروں اور اخبار نویسوں سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ فساد کا بیج بونے سے باز آجائیں (۵) وہ دوسری قوم کے لیڈروں کا اتنا ہی احترام کریں جتنا اپنی قوم کے لیڈروں کا کرتے ہیں، چاہے ان کے درمیان کتنا ہی شدید سیاسی اختلاف کیوں نہ ہو۔

رہنماؤں کی ذمہ داریاں

عوام کے ذہن و شعور کو بدلنے اور عملاً متحد رہنے کے لئے پہلے عوام کے رہنماؤں کو بدلنا ہوگا۔ ہماری قوم وملت کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں جن کو سن کر اور پڑھ کر لوگ اپنی رائے بناتے ہیں، ان کی ایک فیصد تعداد بھی اگر اس قربانی پر آمادہ ہو جائے جو پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان انگلینڈ کے فیبین لوگوں نے دی تھی تو یقینی طور پر ہمارے ملک کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

ہمارے رہنما دراصل سستی شہرت اور سستی تجارت کے عادی ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج قومیں اپنے رہنماؤں کے باوجود بے رہنما ہیں۔ اگر ہمارے رہنماؤں نے اپنی ذہنی سطح سے بلند ہو کر اصلاح پسندی کا طریقہ نہیں اپنایا تو بعید نہیں کہ یہاں ہمیشہ ہمیش کے لئے ہندو مسلم کی آگ بجھنے کی بجائے دہکتی رہے گی اور اسی میں تخریب

اور شرپسند عناصر کو دندناتے رہنے اور مظلوم انسانوں کو پچھاڑ کھانے کے لئے اچھا موقع ملے گا۔ ہمارے رہنماؤں کو درج ذیل چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے۔

(۱) زبان و قلم تعمیر قوم وملت کا ایک اہم ذریعہ ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں کہ ان کا برمحل استعمال نہ ہونے کی خاص وجہ صرف یہ ہے کہ سستی شہرت اور سستی تجارت کا جنازہ نکل جائے گا۔ حالانکہ ان کا کام یہ ہے کہ وہ قوم وملت کے اندر مثبت ذہن اور تعمیری مزاج بنانے میں اپنے زبان و قلم کی ساری طاقت خرچ کریں۔

(۲) کوئی منافرت انگیز بیان نہ دیں۔ اشتعال انگیز تقریریں نہ کریں۔

(۳) ظلم میں اپنی قوم کی حمایت نہ کریں اور مظلومی میں دوسری قوم کی ہمدردی کرنے میں بخل نہ کریں۔

(۴) ملک کا دانشور طبقہ اگر تربیت شعور کی مہم میں اپنے کو فنا کرنے کا عزم کر لے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے لئے کچھ نہ پا سکے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس کی قربانی قوم کو نئی زندگی دینے کا سبب بن جائے گی۔

پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ جس آزادی کے لئے آپ کوشش کر رہے ہیں وہ آزادی کب آئے گی؟ انہوں نے جواب دیا کہ آزادی کا وقت تو نہیں جانتا، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی تو میری لاش پر آزادی کا محل تعمیر ہو کر رہے گا۔

انانیت کی قربانی

انسان کیوں متحد نہیں رہ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہر شخص سے قربانی مانگتا ہے، یہ قربانی کہ فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع کے حوالہ کر دے، آدمی اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے پورے مجموعہ کو اہمیت دینے لگے۔ یہ انا کی قربانی ہے اور انا کی قربانی کسی آدمی کے لئے سب سے زیادہ مشکل قربانی ہے۔ آدمی جان کو قربان کر سکتا ہے، مگر وہ اپنی انا کو دوسرے کے حوالہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسان کی یہی کمزوری ہے

جو ہمیشہ اتحاد و اجتماعیت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

تحمل ناگزیر ہے

اس پُر آشوب دور میں تحمل اور تنظیم سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر دشواریاں اور بڑھ سکتی ہیں اس لئے لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ انھیں اختلاف میں اتحاد کا درس دیا جائے۔ قومی اتحاد ہم کو اختلاف کے باوجود قائم کرنا ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر، کیونکہ ممکن ہی نہیں۔

کتاب الٰہی سے عشق

مسلمان قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار اس لئے ہو گئے ہیں کہ وہ خدا کی کتاب سے اپنے معاملات میں ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ وہ خدا کی عطا کردہ قلب و بصیرت سے کام لئے بغیر زندگی کے راستے طے کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کو چاہیئے کہ خدا کی کتاب سے اپنے جملہ معاملات میں ہدایت حاصل کریں جو کامیابی و ناکامی کا راز ہے۔

خدا منتظر ہے کہ کوئی اس دنیا میں اس کا نغمہ چھیڑے، کوئی اُس کی حمد کا ترانہ سنائے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی نہیں جو خدا کا نغمہ گائے۔ جو آخرت کی بانسری بجائے۔ ہاں وہ لوگ جو اللہ والے ہیں۔

بقیہ: تہذیب الاخلاق اور مولانا مودودی

علی۔ مولانا مودودیؒ کی خدمات اور ان کے جدید ذہن کو دیکھتے ہوئے مارکسزم کے نمائندہ فیض احمد فیض نے مولانا کے متعلق کہا تھا کہ اگر بیسویں صدی میں کوئی کمیونزم کو شکست دے سکتی ہے تو وہ ذات مولانا مودودیؒ کی ہوگی۔ دنیا کے مختلف جدید مفکرین کی ہفوات کا نہ صرف مسکت جواب دیا بلکہ قادیانیت کی تخریب رونمائی کے انعقاد کا سہرا بھی مولانا ہی کے سر ہے۔

ضیاء الرحمان ضیا اعظمی

الوداع اے جامعہ

الوداع اے جامعہ کے بام و در الوداع — صحن گلشن الوداع، شاخ نشیمن الوداع
الوداع اے مادرِ علمی تیری آغوش کو — زلف عنبر بیز کو، تیرے رخ خاموش کو
اپنی آنکھوں میں بسا کر تو نے فرزانہ کیا — علم کی مئے سے سراسر تو نے پیمانہ کیا
اپنے دامن میں چھپا کر قوتِ تسخیر دی — اک تبسم بھی دیا، اک نالۂ تاثیر دی
سینچ کر اپنے لہو سے تو نے سنبل کر دیا — آہ دے کر اپنے دل کی تو نے بلبل کر دیا
اے چمن زارِ الفت اے پیرِ جام و سبو — اے محبت کا سمندر تجھ سے میری آبرو
تیری شاخوں پر چہکنا مسکرانا اب کہاں — بزم خوباں میں چہکنا، گنگنانا اب کہاں
ماہتاب وصل اپنا آج گہنا ہی گیا — آفتاب ہجر میں جلنے کا دن آ ہی گیا
ہائے کیسا تو نے ہم کو آج دیوانہ دیا — "ان ارضی واسعۃ" کا تو نے پروانہ دیا
اے چمن تیرا یہ بلبل مائل پرواز ہے — تیرے آنگن میں یہ اس کی آخری آواز ہے
اپنی پلکوں پر سجا کر عشق کی تنویر کو — رکھ چلا ہے خانۂ دل میں تیری تصویر کو
آ میرے احساں، عزیز و ذوالفقار و سروراں — اٹھ رہا ہے آج میرے خرمن دل سے دھواں
عبد رحمان، خالد و اقرار و عرفان و شکوہ — لگتی ہیں آ کے کھنک شیشۂ دل چور چور
آج عثمان و ضیاء پر یاس و حسرت ہے عیاں — دل میں اک طوفان ہے آنکھوں میں موج بیکراں
اے مرے جابر کہاں تو ہے، یہ تو نے کیا کیا — وقت سے پہلے ہی تو نے داغ فرقت دے دیا
اور ریاض الدین، فیاض و حسن، عبد الحمید — یاد ہیں کہ جب سنے گی تیری گفت و شنید
ساز دل چھیڑو کہ گائیں رنگیں فسانے کیلئے — آہ بھرنے کے لئے، آنسو بہانے کے لئے
جب چمن سے بوئے گل باد صبا لے آئیگی — دل میں اک طوفاں اٹھے گا آنکھ بھی بھر آئیگی
بلبل صد چاک تڑپے گا رفاقت کے لئے — اے ضیا تم سے گو تو چشم عنایت کیجئے
اے مرے الٰہ جلنے کا کوئی سامان کر — یعنی ہم کو آشنائے لذت عرفان کر

پھونک دے تو روح اپنی لاشۂ بے جاں میں
قدسیوں کی تازگی بھر دے مرے ایمان میں

نوٹ: طلبا کی الوداعی نشست میں فارغ ہونے والے ایک طالب علم ضیاء الرحمان ضیا اعظمی نے اپنے تاثرات کو اس نظم کی شکل میں ظاہر کیا۔

خواندگی کا مسئلہ اسلامی تناظر میں

★ ڈاکٹر شبیر محمد زمان

(اس مضمون کو پاکستان کے تناظر میں دیکھا جائے ملت اسلامیہ ہند کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے)

تعلیمات اسلام میں حصولِ علم اور کتابت و خواندگی کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ یہ عجیب حکمت ہے، بلکہ اس کا شمار بھی اعجاز قرآن میں ہونا چاہیے کہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ہی رب کریم کی مشیت کاملہ نے قرآن تجویز فرمایا اور اس کا سب سے پہلے نازل ہونے والا کلمہ اقراء (پڑھ) تھا۔ قرآن مجید میں اس نسخہ کیمیا کو ۷۰ مقامات پر اسی نام سے موسوم کیا گیا۔[1] یہ نام اس کتاب کی شناخت اور اس کا اسم ذات قرار پایا اس نام سے اس کی تعریف و تشہیر ہوئی۔ دنیا کی بیسیوں زبانوں کی لغات میں یہ لفظ اہل اسلام کی مقدس الہامی کتاب کے معنوں میں داخل ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کی ڈکشنریوں میں "KORAN" کا لفظ صدیوں سے شامل ہے اور DIATIONARY OXFORD CONCISE کے جدید ترین ایڈیشن (ساتواں ایڈیشن

۱؎ اس کے علاوہ دو مقامات پر یہ کلمہ محض مصدر کے معنی میں آیا ہے (۷۵: ۱۷، ۱۸)

طبع ۱۹۸۷ء) میں اس کے معنی یوں مندرج ہیں۔

"SACRED BOOK OF MUSLIMS, COLLECTION OF MUHAMMAD'S ORAL REVELATIONS, WRITTEN IN ARBIC"

بیسویں صدی کے وسط سے انگریزی زبان کی لغات میں قرآن کی قدیم مگر غیر صحیح املا یعنی "KORAN" کے علاوہ صحیح املا QUR,AN اندراج بھی بطور متبادل کے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کے متعدد اور نام خود قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں۔ کتاب (لکھی ہوئی تحریر) سمیت ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں: الھدی، الفرقان، الذکر، الحکیم، ذکر، بیان، موعظۃ، ھدی، تبیان، تذکرۃ، نور، کتاب مبین، برھان، مگر توجہ اس امر کی طرف دلانا مطلوب ہے کہ جس طرح لفظ "اللہ" رب کریم کا اسم ذات ہے اسی طرح قرآن اس کتاب الٰہی کا اسم ذات ہے۔ پس اہل اسلام کے لئے یہ بات دعوت فکر کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس امت کے لئے منزل کتاب کا نام ہی ق ر ء کے مادہ سے ماخوذ کلمہ قرآن ہے۔ جس کے معنی ہیں پڑھنے کی چیز۔ کسی ملت کی کوئی مقدس کتاب یا صحیفہ سماویہ اس تاریخی صفت کا حامل نہیں۔

قرآن کریم میں کئی ایسے احکامات ہیں جن کا تعلق براہ راست لکھنے کے فن سے ہے۔ معینہ مدت کے لئے قرض کے لین دین کو معرض تحریر میں لانے کے احکام کا ذکر بر سبیل مثال کیا جا سکتا ہے (۱)۔ اسی طرح قرات و کتابت کے متعدد لوازمات کا ذکر بھی اس کے احترام اور اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ بالخصوص اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلم کی قسم تو اس احترام کی معراج ہے (۲)۔ قرآن مجید کی پہلی سورت میں ہی قلم کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دینا بھی کتابت کے مقام کی رفعت کا پتہ دیتا ہے (۳)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ میں جا بجا تحصیل علم کی تاکید ملتی ہے۔ اور اس بارے میں مرد و زن کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی۔ طلب علم کا حکم سب اہل اسلام کے لئے عام ہے۔ "طلب العلم فریضۃ علیٰ کلّ مسلمٍ"(۴)، (طلب علم ہر مسلم پر فرض ہے) علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین جانا پڑے"۔ والی حدیث تو تاکیدی حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ "مہد سے لحد تک علم حاصل کرو" تعلیم مسلسل کا وہ مرکزی نکتہ ہے جسے دور جدید کے فلسفۂ تعلیم میں ایک انقلابی تصور کی حیثیت سے عالمی شہرت حال ہی میں نصیب ہوئی ہے۔ روایت حدیث کے کڑے اصول کے معیار پر یہ معروف و مقبول قول پورا اترتا ہے یا نہیں، یہ بات زیر نظر موضوع کے تناظر میں اہم نہیں۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ نظریہ یا تصور صدیوں سے اسلامی ثقافت کی تاریخ میں نبی کریم کے ساتھ منسوب ہو کر منقول ہوتا چلا آیا ہے (۵)۔ لہٰذا حدیث کے مستند اور صحیح یا غیر مستند اور غیر صحیح ہونے سے قطع نظر اتنی بات تو بہر حال ثابت ہے کہ اسلامی تہذیب کی میراث میں تعلیم مسلسل کا یہ تصور ایک مثبت اور معقول و مقبول نظریہ کی حیثیت سے بار بار گردش کرتا رہا ہے۔ جبکہ مغرب کے تعلیمی فلسفہ نے حال ہی میں اس نظریہ سے تعرض کیا ہے۔

خواندگی یعنی لکھنے پڑھنے کا فن سیکھنے کے بارے میں نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طاہرہ سے دو باتیں خصوصی توجہ کی متقاضی ہیں۔ اولاً نزول وحی کے ساتھ ہی اسے احاطۂ تحریر میں لانے کا شدت سے اہتمام اور ثانیاً اسیران بدر کے لئے فدیہ طور پر مدینے کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے کی شرط کا تعین (۶)۔ اس موخر الذکر واقعہ سے کتابت و خواندگی کی اہمیت کے ساتھ ہی اس نکتہ کا استنباط ہوتا ہے کہ غیر مسلم سے بھی علم حاصل کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ غیر مسلموں سے ان کی علمی مہارتیں حاصل کر کے ان سے فلاح مسلمین اور دفاع اسلام کا کام لیا جا سکتا ہے۔ طب، سائنس اور ٹیکنالوجی ہی اس دائرہ میں نہیں آتے بلکہ اسلامی

علوم میں بھی مستشرقین سے ان کا اسلوب تحقیق اور منہج استدلال سیکھ کر انھیں اسلام کے فکری و علمی دفاع کے لئے استعمال کرنا بھی اس مفہوم میں یقیناً داخل ہے۔

مزید براں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی صحیح احادیث بھی منقول ہیں جن میں آپ نے صحابیات اور ازواج مطہرات کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ترغیب دلائی (۷)۔

پھر کیا یہ بات انتہائی صدمہ اور دکھ کی نہیں کہ جس اُمت کی کتاب مقدس کا نام ہی قرآن ہو اور جس کے ہر فرد کے لئے جنس، رنگ و نسل، مقام و مرتبہ کی کسی تفریق کے بغیر تحصیل علم کو فریضہ قرار دیا گیا ہو اس کے افراد آج خواندگی کے میدان میں اقوام عالم کی صف میں سب سے پیچھے نظر آئیں۔

بلا شبہ اکثر مسلم ممالک میں طویل استعماری دور نے تاریخی اسباب و عوامل کی بنا پر علمی پسماندگی کو جنم دیا۔ برصغیر کے پس منظر میں ہی دیکھیں تو مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر دور میں مکاتب و مدارس کے اوقاف کا وہ وسیع سلسلہ نظر آتا ہے کہ برطانوی عہد میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر حیرت ہوتی ہے۔ یہی مدارس تھے جن سے حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، لغت، کلام، شعر، تاریخ اور لسانیات کے علماء ہی نہیں نکلتے تھے بلکہ طب و جراحت، ریاضی، ہندسہ، فلکیات کے وہ ماہرین بھی پیدا ہوئے تھے جن کے ہاتھوں کے تعمیری کارنامے آج بھی ان کے علم و فن کی زندہ جاوید شہادت ہیں۔

تعلیم کا جو تعلق کسی قوم یا ملک کی تعمیر و ترقی سے ہو سکتا ہے اس کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ ناخواندگی افراد کو حصول معلومات کے مؤثر ترین ذریعے سے ہی محروم نہیں کرتی بلکہ ان کی تخلیقی قوتوں کا راستہ بھی مسدود کر دیتی ہے۔ کرۂ ارض کا وہ حصہ جو آج بھی ترقی یافتہ دنیا کی تعریف میں آتا ہے وہاں خواندگی کا فیصد کم از کم ایک صدی پہلے ہی امتیازی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ مغربی ملکوں کے علاوہ جاپان کی مثال

اس سلسلے میں بڑی واضح ہے۔

پاکستان میں تقسیم ہند سے کر اب تک خواندگی بڑھانے کی رفتار بڑی سست رہی ہے۔ بحیثیت مجموعی، خواندگی کی شرح ۱۹۵۱ء میں ۱۳.۲ فیصد، ۱۹۶۱ء میں ۱۶.۴ فیصد، ۱۹۷۲ء میں ۲۱.۷ فیصد اور ۱۹۸۱ء میں ۲۶.۲ فیصد تھی۔ عورتوں میں یہ شرح خراب تر ہے۔ شہری علاقوں کے مقابلے پر دیہاتی آبادی کی شرح فیصد انتہائی حوصلہ شکن ہے۔ ملک کے مختلف جغرافیائی خطوں میں شرح فیصد کا تفاوت خاصا نمایاں ہے۔ صوبہ سندھ میں شرح خواندگی ۳۱.۵ فیصد، پنجاب میں ۲۷.۴ فیصد، صوبہ سرحد میں ۱۶.۷ فیصد اور بلوچستان میں ۱۰.۳ فیصد ہے (۸)۔ ملک کے اندر مختلف طبقوں میں شرح خواندگی کے تفاوت کا کمال دیکھنا ہو تو خود فرمایئے کہ قومی سطح پر مردانہ شہری آبادی میں شرح خواندگی ۵۵.۳ فیصد ہے۔ جب کہ زنانہ دیہی آبادی میں یہ شرح ۷.۳ فیصد ہے۔ بلوچستان کی زنانہ دیہی آبادی میں یہ شرح محض ۱.۸ فیصد رہ جاتی ہے۔ (۹)

اس افسوسناک صورتحال کے روایتی اسباب ہمارے سرکاری و نیم سرکاری جائزوں میں بالعموم مندرجہ ذیل بتائے جاتے ہیں۔

۱۔ ہمارے معاشرے میں والدین اپنے بچوں، بالخصوص بچیوں کی تعلیم سے بے توجہی برتتے ہیں۔

۲۔ دیہات میں والدین کی اکثریت ناخواندہ یا غیر تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے بچوں کی تعلیم میں اُن کی توجہ بالعموم اس سطح پر نہیں ہوتی جیسی ہونی چاہئیے۔

۳۔ دیہاتوں اور غریب شہری آبادیوں میں والدین بچوں کو کم سنی میں کسی نہ کسی کام پر لگا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ کنبے کی آمدنی میں کچھ اضافہ کر کے گزارے کی صورت پیدا کر سکیں۔ نصابی کتب کی مہنگائی اس پر مستزاد ہے، یہی وجہ ہے کہ پرائمری سکولوں میں طلباء کے اسکول چھوڑ جانے کی شرح ....

(DROP — OUT RATE) بہت زیادہ ہے۔

۴۔ لڑکیوں کے لئے علیحدہ اسکول مطلوبہ تعداد میں نہ ہونے کے باعث کئی لڑکیاں سکول جانے سے رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ والدین لڑکیوں کو مخلوط اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے

۵۔ دیہات میں آبادی منتشر شکل میں ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے اندازے کے مطابق (پاکستان اکنامک سروے ۸۵-۱۹۸۴ء، ص ۱۷۵) دیہاتی علاقوں کے بیس فیصد لوگ تین سو نفوس کے لگ بھگ آبادیوں میں رہتے ہیں۔ حکومت ان چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں ہر جگہ اسکول فراہم نہیں کر سکتی۔

۶۔ تعلیمی فنڈز کی کمی بھی اس کا ایک اہم سبب ہے۔ پاکستان جی۔ این پی کے ۱.۵ سے ۲ فیصد تک تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ جبکہ ترقی پذیر ممالک کے لئے یونیسکو کی سفارش جی۔ این۔ پی کا کم از کم ۴ فیصد ہے۔

پس چہ باید کرد

افسوس یہ ہے کہ ہمارے پالیسی ساز اور ماہرین کی سوچ کے تار برابر مغربی فکری سرچشموں سے جڑے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک ہمارے ہاں شرح خواندگی کی افسوسناک کمی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہم اس کے علاج کے لئے ہمیشہ مغرب سے درآمد کردہ نسخے اور نعرے استعمال کرتے رہے ہیں۔ کبھی "EACH ONE TEACH ONE" کی تکرار، کبھی ایک فرد کو پڑھائیے ہزار روپے کمائیے" اور "علم پھیلائیں دولت کمائیں" کا نعرہ۔ اسی طرح خواندگی کی دعوت کے ضمن میں خط پڑھنے، اخبار بینی اور حساب کتاب کی سہولت کا ذکر تو کیا جاتا ہے مگر "قرآن پڑھو" کی مہم آج تک نہیں چلائی گئی۔ جو عام خواندگی

کے لئے موثر ترین قابل استعمال زینہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح یہ تو کہا جاتا ہے کہ خواندگی کی کتابوں اور مابعد خواندگی کے مواد میں لوگوں کے ماحول، صحت، زراعت، حرفت وغیرہ پر نظر مرکوز رکھی جائے تاکہ وہ اس مواد میں دلچسپی لے سکیں۔ مگر ہمارے معاشرے میں مذہب کے حوالے سے نماز، روزہ، نکاح، طلاق، میراث، قربانی، فطرانہ اور عید نماز وغیرہ کے مسائل کی اہمیت کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ جن سے ہمارے عوام کی اکثریت کو خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی طرح مساجد کو خواندگی کی بنیادی مراکز کی حیثیت دینے کے مسئلہ پر کوئی توجہ مبذول نہیں ہوتی اگرچہ محدود پیمانے پر مسجد، مکتب، مدرسہ کے ذریعہ پرائمری مدارس کو مسجد کی عمارتی سہولتیں فراہم کرنے کا اہتمام ضرور کیا گیا ہے۔

چالیس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو خواندگی کی طرف مائل کرنا بہی طور پر زیادہ مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ ان کا یہ ردعمل عام طور پر نقل کیا جاتا ہے کہ بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے۔ مگر خواندگی کی دعوت قرآن کریم اور اس کا ترجمہ پڑھنے کے حوالے سے دی جائے اور ریڈیو، ٹی وی کے علاوہ مساجد کے منبروں سے بیک آواز اس کی تکرار ہو تو اس میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

خواندگی کو آسان بنانے کے لئے دو اہم نکات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے۔

اولاً ہماری کل آبادی میں ۴۱.۳ فیصد خواتین اور ۳۵.۸ فیصد مرد ناظرہ قرآن پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں (۱۰)۔ شہری آبادیوں میں یہ شرح اور بھی بہتر ہے یعنی خواتین کے لئے ۵۹ فیصد اور مردوں کے لئے ۴۸ فیصد: دیہاتی علاقوں میں یہ شرح کم تر ہونے کے باوجود خاصی معقول ہے (خواتین ۲۳.۶ فیصد اور مرد ۳۰.۲ فیصد) ان اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ نسخ رسم الخط کو خواندگی کے مواد کے لئے استعمال کر کے خاصی پیش رفت کا امکان ہے ظاہر ہے کہ ناظرہ قرآن پڑھے ہوئے لوگ نسخ رسم الخط اور تمام عربی الاصل حروف سے

مانوس ہوں گے اردو یا مادری زبان (سندھی، پشتو وغیرہ) کے اضافی حروف سکھا کر انھیں نسبتاً کم وقت میں عام خواندگی سکھائی جا سکتی ہے۔

ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا بھی مفید ہوگا۔ نسخ رسم الخط، بنیادی طور پر اپنی سادگی اور سہولت کے باعث ناخواندہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا، سکھانے میں پیش آنے والی مشکلات کو بہت کم کر سکتا ہے پھر جو لوگ پہلے ہی قرآن ناظرہ پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے تو یہ مرحلہ کئی درجے آسان تر ہو جاتا ہے۔ یہ بات معروضی طور پر ثابت کی جا چکی ہے۔ ناخواندہ گروہوں کے ساتھ میرے اپنے تجربات نے اس کو درست ثابت کیا ہے۔ پاکستان میں اس طرح کا کوئی باقاعدہ تحقیقی و تقابلی منصوبہ تو میرے علم میں نہیں مگر یونیورسٹی آف پنسلوینیا کی ایک تحقیقی ٹیم مراکو میں اپنی تحقیقات کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ جن بچوں کی مادری زبان بربری تھی مگر وہ قرآن پاک پڑھ چکے تھے انہوں نے اپنے ہم مکتب بچوں سے جو پہلے قرآن ناظرہ پڑھ کر نہیں آئے تھے کہیں پہلے عربی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لی۔

ثانیاً ان اعداد و شمار میں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ناظرہ قرآن پڑھے ہوئے افراد میں عام خواندگی کی شرح کے برعکس خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ خواندگی کے لئے چلائی جانے والی قریباً ہر تجرباتی مہم میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ خواتین میں لکھنا پڑھنا سیکھنے کی خواہش اور اس عمل میں ان کے ثبات و استقلال کا درجہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ دینی باتوں سے ان کی دل بستگی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان عوامل کی روشنی میں اگر ایک زوردار تحریک قرآنی ترجمہ اور دینی مسائل کے نسخ میں مطبوعہ رسالوں کے ساتھ بالخصوص خواتین کے لئے ترجیحاً خواتین ڈونرز کی سرپرستی میں چلائی جائے تو اس میدان میں اس مخصوص دائرے کے اندر خاصی سرعت کے ساتھ پیش رفت

(بقیہ : صفحہ ۴۷)

★ عبدالحمید قلب بستوی

جامعہ سے خطاب

اک جہاں پوشیدہ تیرے سینۂ مضطر میں ہے — ایک دریا موجزن تیرے ہر اک گوہر میں ہے
قوتِ تسخیرِ عالم میرے بال و پر میں ہے — برقِ ایمن بے قرار اب میری خاکستر میں ہے

بلبلِ بیتاب کو اب نے چمن آزاد کر
ہر گل کو آشنائے لذتِ فریاد کر

ہم ترے بکھرے ہوئے موتی تو بحرِ بیکراں — ہم ترے شاہیں ہیں اور تو ہمارا آشیاں
اس جہانِ خار و خس میں ہم حزین و بے نشاں — اب یہ مرغانِ حرم تیرے ہوئے ہیں پرفشاں

تجھ سے ٹوٹا آہ میرا رشتۂ دیرینہ اب
لمحہ لمحہ ہو رہا ہے قصۂ پارینہ اب

اس شبِ دیجور میں مشعل بہ کف ہے تو — علم و فن کے ہر مسافر کے لئے منزل ہے تو
جس سے روشن دل کی دنیا ہوگئی مشعل ہے تو — جس سے اٹھے قیس اور فرہاد وہ محمل ہے تو

ہم نے بھی تجھ سے لیا ہے درسِ آدابِ جنوں
اٹھ کے تیری بزم سے توڑیں گے باطل کا فسوں

تیرے دم سے رونقِ بزمِ جہانِ رنگ و بو — ہم ہیں زندانِ مئے توحید تو جام و سبو
ساقیا محفل میں کردے عام مئے اللہ ھو — نغمۂ انسانیت کو کر نہ تو قیدِ گلو

چاک کردے ظلمتِ شب کی قبا ماہِ تمام
پختہ تر کردے فدائے عشق ہو گر سودائے خام

مردہ دل کو اک جہانِ تازہ کا پیغام دے — میری فکرِ نارسا کو چرخِ نیلی فام دے
ہم اسیرِ روز و شب کو گردشِ صبح و شام دے — چشمِ گوہر بار دے اور قلبِ تشنہ کام دے

ہند کی مٹی سے پیدا سعدیٔ شیراز کر
عشق کی مضراب سے پیدا نوائے ساز کر

نوٹ: اسلامیات فارغ ہونے والے طلبہ کی الوداعی نشست میں فارغ ہونے والے ایک طالب علم عبدالحمید قلب بستوی نے اپنے تاثرات کو اس نظم کی شکل میں پیش کیا۔

دوسری قسط

تحریر: ڈاکٹر کوثر عبدالفتاح الابجی
کامرس ڈپارٹمنٹ قاہرہ یونیورسٹی
ترجمانی: عبدالحی فاروق فلاحی
شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلامی عشور اور جدید محاصل

گزشتہ بحث سے مسلمانوں، ذمیوں اور اہل حرب ہر ایک کے لئے عشور کی الگ الگ نوعیت واضح ہو گئی۔ اب ہم زکوٰۃ عشور اور محصول عشور پر بالتفصیل روشنی ڈالیں گے اور ان کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانوں پر عائد عشور یا زکوٰۃ تجارت

مسلمانوں پر عائد عشور کے احکام کی دو قسمیں ہیں (۱) عمومی احکام جو علی الاطلاق زکوٰۃ تجارت کے ساتھ خاص ہیں۔ (۲) خصوصی احکام جو عاشر کے پاس سے گزرنے والے تجارتی اموال کی زکوٰۃ کے ساتھ خاص ہیں۔

عمومی احکام مال کی زکوٰۃ زکوٰۃ تجارت صرف اسی مال پر وصول کی جائے گی جو بطور خاص تجارت ہی کے مقصد سے تیار کیا گیا ہو۔ یعنی مال کی تیاری میں عمل اور نیت دونوں تجارت کی ہو۔ عمل یہ کہ آدمی فروخت کرنے کے لئے ہی سامان خریدے اور نیت یہ کہ منافع کمانے کا ارادہ ہو۔ ان دونوں میں سے صرف کوئی ایک چیز کافی نہیں ہے۔[۳]
زکوٰۃ تجارت سال میں صرف ایک بار وصول کی جائے گی۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:
"ایک ہی مال کی زکوٰۃ دو بار نہیں لی جائے گی۔"
مال تجارت کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ حضرت میمون بن مہران اس کے متعلق فرماتے ہیں: "جب تم پر زکوٰۃ عائد ہو جائے تو دیکھو کہ تمہارے پاس کیا نقد یا سامان تجارت ہے۔ اس کی بھی نقد قیمت لگاؤ۔ اس کے بعد جو قرض ہو اس کا بھی حساب

کر لو۔ پھر قرض کو مستثنیٰ کر کے جو مال بچے اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔[۳۹]

گویا نقد مال کے ساتھ ساتھ سامان تجارت کی بھی زکوٰۃ دی جائیگی۔ موجودہ قیمت کے لحاظ سے سامان تجارت کا حساب کر لیا جائے گا۔ اسی طرح قرضوں کا بھی حساب کیا جائے گا۔ پھر تجارتی کاروبار سے متعلق قابل وصول قرضے مستثنیٰ کر کے بقیہ پر زکوٰۃ دی جائیگی۔

زکوٰۃ نصاب مکمل ہونے پر واجب ہوتی ہے۔ نصاب ۲۰ دینار ہے۔ تکمیل نصاب کے وقت کی تعیین میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض صرف آخر سال میں تکمیل نصاب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً امام مالک۔ جو لوگ پورے سال بقدر نصاب مال کی موجودگی کو لازم قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک دوران سال کسی بھی وقت مال مقررہ نصاب سے کم ہو جائے تو زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ حنابلہ ابو عبیدہ اور ابن المنذر کا قول ہے۔ بعض لوگ شروع اور آخر سال میں تکمیل نصاب کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ رح اور ان کے اصحاب کا خیال ہے[۴۰]

جب نصاب پورا ہو جائے اور سال پورا ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے "ہر دو سو دینار میں پانچ دینار، اور جو مزید ہو اس میں اسی حساب سے"۔ یا جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: "ہر چالیس دینار میں ایک دینار۔ اور جو کم ہو اس میں اس حساب سے۔ اور اس طرح نصاب بیس دینار ہو جاتا ہے اور اگر مال اتنا کم ہو جائے کہ اس میں صرف ½ دینار زکوٰۃ عائد ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔"[۴۱]

چند صورتیں جو زکوٰۃ تجارت سے مستثنیٰ ہیں

امام ابو یوسف رح نے حسب ذیل صورتوں میں مسلمانوں کے مال کو عشور سے مستثنیٰ کیا ہے[۴۲]

(۱) جب کوئی مسلم عاشر کے پاس سے بھیڑ، گائے یا اونٹ لے کر گزرے اور کہے کہ یہ میرے سائمہ ہیں۔ (یعنی عوامی چراگاہ میں چرنے والے جانور نہیں ہیں) اور قسم کھائے تو اس سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۲) اسی طرح کوئی غلہ لے کر گزرے اور کہے کہ یہ میرے اپنے کھیت کا ہے یا کھجور لے کر گزرے اور کہے کہ یہ میرے اپنے باغ کی ہے (یعنی تجارت کی غرض سے خریدی ہوئی نہیں ہے)، تو اس

عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۳) کوئی تاجر عاشر کے پاس سے مال لے کر گزرے اور کہے کہ اس کی زکوٰۃ دی جا چکی ہے اور قسم کھائے تو اس کی قسم قابل قبول ہوگی اور زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

(۴) اسی طرح اگر غلام اپنے مالک کا اور اپنا سامان ساتھ لے کر گزرے تو اس مال پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے جب تک کہ مالک نہ آجائے۔ اسی طرح مکاتب پر بھی عشر نہیں ہے۔

(۵) اگر تاجر انگور، تازہ کھجور یا غیر پختہ پھل لے کر گزرے جسے تجارت کی غرض سے خریدا گیا ہو اور اس کی قیمت ۲۰۰ درہم سے کم ہو، وہی سامان بار بار لے کر گزرے اور ہر دفعہ الگ الگ قیمت بتائے، اور ہر پھیرے کی رقم جوڑ دینے پر ہزار درہم تک پہونچ جاتی ہے۔ تو اسمیں بھی زکوٰۃ نہیں ہے اور ہر پھیرے کی بتائی ہوئی رقم کو ایک دوسرے میں نہیں جوڑا جائے گا۔

اہل ذمہ کے عشور

ابن آدم قرشی کہتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حدیر کو کہتے سنا۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام میں عشر وصول کیا۔ قرشی کو ایک اور شخص نے ابن حدیر کے متعلق بتایا کہ وہ بنی تغلب سے نصف عشر وصول کرتے تھے اور قرشی نے داؤد بن کردوس کے واسطے سے بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بنی تغلب کے ساتھ معاہدہ کیا کہ ان کے صدقہ میں اضافہ کر دیا جائے لیکن لوگ (آمدنی میں کمی کے خوف سے) بنی تغلب کے کسی آدمی کو اسلام قبول کرنے سے نہ روکیں۔[۴۳]

ابن لیلیٰ کہتے ہیں کہ بنی تغلب کے نصاریٰ سے عشر وصول کرنے کے لئے لوگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اور حسن کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ دوسرے ذمیوں کے مویشیوں، پھل اور کھیتوں سے عشر وصول کرنے کے لئے کسی کو نہیں بھیجا جاتا تھا۔ البتہ بنی تغلب اور دوسرے تمام اہل ذمہ سے ان کے مال تجارت میں عشر وصول کیا جاتا تھا۔[۴۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ذمہ سے عشور زکوٰۃ کے دوگنا وصول کئے جائیں گے اس کی نظیر بنی تغلب کے واقعہ میں ملتی ہے کہ جب انھوں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا اور حضرت عمرؓ سے جزیہ گھٹانے کا مطالبہ کیا تو حضرت عمرؓ نے جزیہ ہٹا کر زکوٰۃ کے دوگنا

رقم عائد کردی۔

اس طرح اہل ذمہ کے عشور کا مطالعہ ہم حسب ذیل چھ موضوعات کے تحت کر سکتے ہیں۔

(۱) نصاب کی تعیین امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ذمی عاشر کے پاس سے دو سو درہم سکے کی شکل میں یا بیس مثقال چاندی کی شکل میں یا دو سو درہم چاندی کی شکل میں یا بیس مثقال سکے کی شکل میں لے کر گزرے تو اس سے نصف عشر لیا جائے گا۔ پھر پورے سال اس سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا خواہ وہ مال کتنی ہی مرتبہ لے کر گزرے۔ اسی طرح کوئی بھی سامان لے کر گزرے اور اس کی قیمت بیس مثقال تک ہو تو عشر وصول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔[45]

لیکن ابو عبید کہتے ہیں کہ ابو سفیان کہا کرتے تھے کہ اگر ذمی مال لے کر گزرے تو اس سے اس وقت عشر لیا جائے گا جب تک اس کی قیمت سو درہم تک نہ پہنچ جائے، سو درہم کا نصاب پورا ہونے کے بعد نصف عشر وصول کیا جائیگا۔[46]

امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ اگر ذمی عاشر کے پاس سے مال تجارت لے کر گزرے تو اس سے نصف عشر وصول کیا جائیگا خواہ اس کی قیمت دو سو درہم تک نہ پہنچتی ہو۔[47]

ابو عبید امام مالکؒ اور اہل حجاز کے نزدیک دو سو درہم سے بھی کم مالیت پر عشر کے واجب ہونے کی یہ دلیل کرتے ہیں کہ اہل ذمہ سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ نہیں ہے کہ اس کا نصاب دیکھا جائے بلکہ یہ جزیہ کی مانند ہے جو امیر و غریب ہر ایک سے بقدر استطاعت وصول کیا جاتا ہے اور جس مقدار پر ان سے صلح ہوتی ہے۔ ابو سفیان نے سو درہم کا نصاب (اس سے کم کی مقدار کو نظر انداز کر کے) یہ سوچ کر مقرر کیا ہے۔ کہ اہل ذمہ سے مسلمانوں کی زکوٰۃ کے دوگنا صدقہ وصول کیا جاتا ہے۔ یعنی دو سو درہم میں دس درہم۔ تو فرع مال کو بھی اس کی اصل پر ہی قیاس کیا جائے گا اور اس طرح سو درہم میں پانچ درہم واجب ہوگا۔[48]

ابو عبید بھی ان الفاظ میں اس کی تائید کرتے ہیں: "سفیان کا قول ہی میرے

نزدیک زیادہ صحیح بر عدل ہے اور یہی حضرت عمرؓ کی منشا سے بھی زیادہ مناسبت رکھتا ہے اس کی تفسیر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زریق بن حیان کے نام ایک مکتوب میں کی تھی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اہل ذمہ کی تجارت پر ہر بیس دینار میں ایک دینار وصول کرو۔ بیس دینار دو سو درہم کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس طرح حضرت عمر بن الخطاب کے حدیث کی تاویل حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تفسیر کے مطابق ہو جاتی ہے"[49]

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بیشتر اقوال کے مطابق سو درہم یا بیس دینار سے کم مالیت کی چیز عشر سے مستثنیٰ ہے جبکہ اس کی قیمت رائج سکوں کے مطابق لگائی جائے۔[50]

(۲) قرض کے احکام

ابو سفیان اور اہل عراق کا کہنا ہے کہ اگر تاجر کہے کہ اس پر قرض ہے یا یہ مال میرا نہیں ہے اور قسم کھالے تو اس کی بات تسلیم کر لی جائے گی اور کچھ وصول نہیں کیا جائیگا۔ امام مالکؒ کا خیال ہے کہ اگر ذمی کہے کہ اس پر قرض ہے تو اس کی بات نہیں تسلیم کی جائے گی اور اس سے نصف عشر لیا جائے۔ اسی طرح اس صورت میں بھی وصول کیا جائے گا جب میوہ یا ایسی کوئی چیز لے کر گزرے جسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے یا کسی چیز کے مال تجارت ہو جانے کی صورت میں وافر مقدار میں باقی نہ رہنے کا خطرہ ہو۔[51]

(۳) پورا سال گزرنے کی شرط

امام ابو یوسفؒ بنو تغلب کے ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ ایک عاشر میرے ایک ہی مال پر سال میں دو بارہ عشر لگانا چاہتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر عامل عشور زیاد بن حدیر کو لکھا کہ اس شخص سے اگلے سال آج ہی کے دن تک دوبارہ عشر نہ وصول کیا جائے الا یہ کہ یہ شخص کوئی دوسرا مال لے کر گزرے۔[52]

ابو سفیانؒ اور اہل عراق کا کہنا ہے کہ ایک ہی مال پر سال میں صرف ایک بار عشر وصول کیا جائے گا خواہ کتنی ہی مرتبہ لے کر گزرے۔ البتہ امام مالکؒ اور اہل حجاز کے نزدیک تاجر جب مال لے کر گزرے، ہر مرتبہ وصول کیا جائیگا۔ [53]

ابو عبید ان دونوں آراء میں اختلاف کی تشریح اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر دوسرا مال بعینہ وہی ہو جو پہلی مرتبہ لے کر گزرا تھا تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی اس کے منافع سے کچھ وصول کیا جائے گا کیونکہ اپنے اوپر عائد ہونے والا حق وہ ادا کر چکا ہے۔ البتہ اگر دوسرا مال لے کر گزرے تو عشر لیا جائے گا۔ اسی طرح اگر اپنے ملک لوٹنے کے بعد ہر مرتبہ مال بدل دیا کرے اور نیا مال لے جائے تو ہر مرتبہ وصولی کی جائے گی کیونکہ ایک مال کا عشر دوسرے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے کوئی مسلمان تاجر ایک مال تجارت پر زکوۃ عشور ادا کرے اور پھر دوسرا مال لے کر جائے تو پھر اس مال پر بھی عشر وصول کیا جائے گا اور پہلا عشر دوسرے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ [54]

اس طرح ابو عبید نے دونوں صورتوں کے درمیان تفریق کی وضاحت کی ہے۔ یہی تطبیق نصرانی کے واقعہ سے بھی مناسبت رکھتی ہے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی رائے بھی اسی کے موافق ہے۔ اور اسی کی تائید تاریخ کے بعض محققین بھی کرتے ہیں۔

(۴) عشور سے چند مخصوص مستثنیات

ابو عبید کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ زیتون کا تیل اور گیہوں پر اہل حرب سے نصف عشر لیتے تھے تاکہ یہ سامان زیادہ مقدار میں مدینہ آسکے۔ اور روئی پر پورا عشر لیتے تھے [55] گویا مقررہ تناسب یعنی عشر کے بجائے ضروری غذائی اشیاء کے تناسب میں کمی کر دی جاتی تھی تاکہ شہریوں کو معقول قیمت پر یہ اشیاء فراہم ہو سکیں۔

اسی طرح پالتو جانوروں اور استعمال کی خاطر رکھے ہوئے غلے پر بھی عشر نہیں ہے اس کے متعلق امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں [56] اگر مسلم بھیڑ بکریاں لے کر عاشر

کے پاس سے گزرے اور کہے کہ یہ ابھی بچے ہیں اور تجارتی نہیں ہیں بلکہ گھر پر پالے جانے والے ذاتی استعمال کے جانور ہیں اور قسم کھائے تو اس سے عشر نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح غلہ لے کر گزرے اور کہے کہ یہ میرے اپنے کھیت کا ہے تو اس پر بھی عشر نہیں ہے۔ عشر صرف اس مال پر ہے جو تجارت کی غرض سے خریدا گیا ہو۔ ایسا ہی معاملہ ذمی کے ساتھ بھی ہوگا لیکن اس معاملے میں حربی کی بات قابل قبول نہیں ہوگی۔ [57]

شراب اور خنزیر کا محصول

حضرت عمر بن الخطاب سے مروی ہے اور اس کی تائید حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی کی ہے کہ عتبہ بن فرقد نے حضرت عمرؓ کے پاس صدقہ خمر کے چالیس ہزار درہم بھیجے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ تم نے میرے پاس شراب کی زکوۃ بھیجی ہے جبکہ مہاجرین کے مقابلے میں تم خود اس کے زیادہ مستحق تھے اور لوگوں کو بلاکر بتایا اور اعلان کیا "بخدا اب اسے کوئی ذمہ داری نہ دوں گا" راوی کا بیان ہے کہ پھر عتبہ بن فرقد نے صدقہ خمر لینا چھوڑ دیا۔ اسی طرح عدی بن ارطاۃ کے نام حضرت عمر بن عبد العزیز کے خط میں عشور خمور کی ممانعت آئی ہے اور وصول شدہ رقم صاحب خمر کو واپس کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ [58]

جب ذمی شراب یا خنزیر لے کر گزرے تو اس پر بھی عشر وصول کرنا صحیح نہیں خواہ ذمی ہی ان کی فروخت کا ذمہ دار ہو کیونکہ عشور جزیہ کی مانند نہیں ہیں کیونکہ جزیہ اہل حرب کی ذات اور ان کی آراضی پر عائد ہوتا ہے جبکہ عشر خود شراب یا خنزیر پر ہوا۔ اسی لئے ان کی قیمت لینا صحیح نہیں کیونکہ نبیؐ نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی چیز حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت بھی حرام ہو جاتی ہے [59]

امام ابو یوسفؒ کا خیال ہے کہ اگر ذمی عاشر کے پاس سے شراب یا خنزیر لے کر گزرے تو اس کی قیمت لگا کر نصف عشر لیا جائے گا۔ اسی طرح ان کے نزدیک ان چیزوں پر اہل حرب سے پورا عشر لیا جائے گا [60]

سفیانؒ کا خیال ہے کہ اگر ذمی عاشر کے پاس سے شراب یا خنزیر لے کر گزرے تو اس سے دوگنا عشر وصول کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ کا خیال ہے کہ اگر ذمی شراب اور خنزیر لے کر گزرے تو شراب پر عشر وصول کیا جائے گا لیکن خنزیر پر نہیں محمد بن الحسن سے بھی ان کے متعلق یہی قول سنا گیا ہے[۶۱]

اس طرح شراب اور خنزیر کے متعلق فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

(۶) عمال عشور کی صفات

امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں: "عشور کی وصولی کے لئے ایسے لوگ متعین کئے جائیں جو نیک اور دیانت دار ہوں۔ انھیں حکم دیا جائے کہ معاملہ کرتے وقت حد سے تجاوز نہ کریں اور نہ حق واجب سے زیادہ وصول کریں۔ جو ضوابط ان کے لئے مقرر کئے ہیں ان کی پیروی کریں پھر ان کی جانچ کی جائے کہ گزرنے والوں کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں؟ انھیں جو اختیارات دیئے گئے ہیں اس سے تجاوز تو نہیں کرتے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کریں تو انھیں معزول کر دیا جائے اور سزا دی جائے۔ اگر کسی سے حق واجب سے زیادہ رقم وصول کی گئی ہو تو اسے چھین لیا جائے۔ البتہ اگر وہ حکم عدولی نہ کریں، مسلمانوں پر ظلم نہ کریں تو انھیں اپنے عہدے پر برقرار رکھا جائے، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے کیونکہ جب تک تم حسن اخلاق اور دیانت پر انعام دیتے رہو گے اور ظلم و تعدی پر مواخذہ کرتے رہو گے محسن اعظم بھی تمہارے اوپر احسان کرتا رہے گا اور ظالم کو تمہارے اوپر ظلم کرنے سے باز رکھے گا۔"[۶۲]

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بھی لوگوں سے بزور عشر وصول کرنے کو ناپسند فرمایا ہے اور اپنے عمال کو نرمی کرنے کا حکم دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ جو تمہارے پاس خود صدقہ لائے اسے قبول کر لو اور جو نہ لائے اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کا قول ہے "جس سے ہم نے صدقہ لے لیا اب اس سے نہیں لیں گے حتیٰ کہ وہ خود ہی تطوعاً دیدے"[۶۳]

مسروق سے بھی اسی قسم کی ایک حدیث مروی ہے۔ وہ عراق میں امیر تھے اور

عاشر کے کام میں خدا سے بہت ڈرتے تھے۔ اپنے عمال سے کہا کرتے کہ بخدا میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے مجھے جہنم میں جانے کا خوف ہو بجز اس کام کے۔ میں نے اس کام میں کسی مسلم معاہد پر ایک درہم یا دینار کا بھی ظلم نہیں کیا۔ لیکن نہ معلوم یہ رسی کیسی ہے جسے نہ رسول اللہ ﷺ نے جاری فرمایا نہ حضرت ابو بکرؓ نے نہ حضرت عمرؓ نے۔ مسروق نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ایک رسی ہوا کرتی تھی جسے نہر پر باندھ دیا جاتا تھا تاکہ کشتیوں کو روک کر عشر وصول کیا جائے۔ مسروق نے اس کو ناپسند فرمایا کہ لوگوں سے زبردستی وصولی کی جائے[۶۴]

اسی طرح حضرت زیاد بن حدیر کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے سب سے پہلے عشر وصول کرنے بھیجا اور حکم دیا کہ کسی کی تلاشی نہ لوں۔[۶۵]

مذکورہ تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ عمال کے اندر حسب ذیل صفات ہونی چاہئیں:

(۱) اخلاقی اوصاف، دیانت، امانت اور تقویٰ

(۲) اشیاء، تجارت اور تجارتی معاملات سے واقفیت

(۳) بوقت ضرورت واقف کار لوگوں سے تعاون حاصل کرنے کی صلاحیت

(۴) وصولی کے وقت نرمی اور خوش معاملگی۔ لوگوں سے زبردستی وصول کرنے سے اجتناب۔

(۳) اسلامی عشور کی خصوصیات

معروف مالی محصولات کے مزاج کی روشنی میں اسلامی عشور کی خصوصیات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) یہ ایک مخصوص قسم کا محصول ہے۔ کیونکہ یہ ایک خاص قسم کے مال۔ مال تجارت۔ اور اس کے حاصل ہونے والے فائدہ پر وصول کیا جاتا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ مختلف قسم کے مالوں پر عائد ہونے والی زکوٰۃ بھی ایک مخصوص قسم کا محصول ہے کیونکہ ہر قسم کے مال پر ایک نہ ایک طرح کا محصول عائد ہوتا ہے۔ گویا اسلام کا مالیاتی نظام یکساں قسم کے محاصل کے بجائے مختلف قسم کے محاصل عائد کرتا ہے۔

(۲) یہ محصول سالانہ ہے۔

مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زکوٰۃ عشور اور محصول عشور سال میں کسی بھی مال پر صرف ایک مرتبہ لاگو ہوتے ہیں۔ جیسے مال مل جائے تو اس پر یہ محصول لگ جائے گا۔ عموماً ٹیکس سال کے آغاز میں وصول کئے جاتے ہیں۔

(۳) یہ راس المال اور منافع دونوں کا محصول ہے۔

زکوٰۃ کی بیشتر قسمیں راس المال پر لاگو ہوتی ہیں جنھیں فائدے کی غرض سے تجارت میں لگایا جاتا ہے، بالفاظ دیگر راس المال ہی اصلاً فائدے اور منافع کا ذریعہ ہوتا ہے جو کبھی سامان تجارت، کبھی نقد رقم اور کبھی جانوروں کی شکل میں ہوتا ہے۔ رہے ذرائع پیداوار تو وہ بھی اگرچہ بالواسطہ فائدے کا سبب بنتے ہیں لیکن اصلاً وہ خود ترقی اور فائدے کا سبب نہیں ہیں اسی لئے انھیں زکوٰۃ عشور سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی عشور خواہ زکوٰۃ عشور کی شکل میں ہوں یا غیر مسلموں پر محصول عشور کی شکل میں، صرف راس المال یا سامان تجارت پر لگتے ہیں۔

سامان تجارت کی رائج قیمت لگائی جائے گی نہ کہ بیع ضرورت کی قیمت، یعنی وہ قیمت جو کسی خصوصی ضرورت کے تحت کم کرکے لگائی جاتی ہے، سامان سے حاصل ہونے والے فائدہ کا اندازہ قیمت لگاتے وقت کر لیا جائے گا اور اس طرح عشور میں راس المال اور فائدہ دونوں شامل ہو جائے گا۔

(۴) یہ محصول صرف تجارت کی غرض سے تیار کی جانے والی اشیاء پر لگایا جائیگا۔

عشور کی وصولی کے لئے ضروری ہے کہ مال نیت اور عمل دونوں اعتبار سے بغرض تجارت تیار کیا گیا ہو۔ چنانچہ ذاتی سامان یا وہ سامان جو شخصی استعمال کے لئے تیار کیا گیا ہو عشور سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۵) اس محصول کی شرح مختلف ہے:

تاجر کے عقیدے کے مطابق اس محصول کی شرح مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر تاجر مسلمان ہے تو محصول ۲٫۵ فیصد ہوگا جو زکوٰۃ کی شرح ہے۔ اگر ذمی ہو تو ۵ فیصد

ہوگا، اور اگر تاجر حربی ہے تو محصول بالمثل ہوگا، یعنی وہ مسلمانوں سے اپنے ملک میں جو تناسب وصول کرتے ہیں، اتنا ہی وصول کیا جائے گا۔

(۶) یہ محصول کم ترین قیمت کے اعتبار سے وصول کیا جائے گا۔

اس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اس محصول کی قیمت، اس وقت کے دیگر ٹیکس کے مقابلے میں آخری حد تک کم ہو۔ قیمت میں یہ کمی پیداوار کی لاگت Production اور Marketing Expenses کے اخراجات میں کمی کا باعث ہوگی اور اس طرح معقول قیمت پر سماج کی ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ اور ہر شخص بسہولت ضرورت کی چیزیں خرید سکے گا اور نتیجۃً تجارت، تبادلہ اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ ملے گا۔

(۷) حالات کی تبدیلی سے بھی محصول کی قیمت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

اس کی وضاحت حضرت عمرؓ کے اس اقدام سے ہوتی ہے جب آپ نے مدینہ منورہ میں قحط کے وقت غذائی اشیاء کی درآمد پر اہل حرب کے عشور تجارت میں نصف کی کمی کر دی تھی۔ اس وقت مدینہ کے اندر غذائی اشیاء اور پیداواری سامان کی سخت قلت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت عمرؓ کی اس حکمت سے مدینہ کے اندر تجارتی قافلوں کی آمد تیز تر ہو گئی اور بہت جلد قحط پر قابو پا لیا گیا۔ ٹیکسوں کی وصولی میں اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ معاشرہ کن حالات سے گزر رہا ہے۔ مالی نظام کو ہمیشہ لوگوں کی ضرورتوں کے موافق ہونا چاہئے۔

(۸) یہ شخصی محصول ہے:

اس سلسلے میں دو باتیں ملحوظ رکھی جائیں گی:

(۱) تاجر کے قرض اور مشقتوں کی رعایت کی جائے گی۔ اگر تاجر مسلم ہے اور قرض کو حلف یا دلیل کے ذریعہ ثابت کر دے تو اس پر غور کیا جائے گا اور اس کے مال سے قرض کی رقم مستثنیٰ کر دی جائے گی۔ اس کے بعد اگر نصاب مکمل رہے تو اس پر زکوٰۃ نافذ ہوگی۔

اگر قرضدار ذمی ہے تو اس کی قسم میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ قرض

ثابت کر دے خواہ مستند دستاویزات کے ذریعہ یا مسلمان گواہ کے ذریعہ تو اس کی رعایت کی جائے گی۔

(ب) تکمیل نصاب کی رعایت کی جائے گی اور اگر مال نصاب سے کم ہے تو عشور کا نفاذ نہیں ہوگا۔ مسلم کے لئے نصاب، زکوٰۃ کا معروف نصاب ہے البتہ ذمی کے لئے کوئی نصاب ہے یا نہیں، اسمیں اختلاف ہے۔ بیشتر اقوال کوئی نہ کوئی نصاب مقرر کرنے کے حق میں ہیں۔

(۹) اس میں چند مستثنیات بھی ہیں:

(۱) اموال مضاربت کا استثناء

اموال مضاربت اس لئے مستثنیٰ ہوتے ہیں کہ مضاربت کرنے والا اصلاً مال کا مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ صاحب مال کی ملکیت ہوتا ہے اور سال گزرنے پر صاحب مال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ سامان تجارت نقد کی شکل میں تبدیل ہو جائے تو نقد پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

(ب) قرض اتنا ہو کہ پورا مال اس میں صرف ہو جائے یا اسے نصاب سے کم کر دے۔

(ج) جس مال کی زکوٰۃ دی جا چکی ہو وہ بھی ایک سال تک عشور سے مستثنیٰ ہے اور اس پر دوبارہ زکوٰۃ نہیں وصول کی جائے گی۔ ایک مال پر سال میں صرف ایک بار صدقہ وصول کرنا اسلام کے نظام محصولات کا ایک بنیادی قاعدہ ہے۔ اور اس سلسلے میں زکوٰۃ کی فرضیت کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔

(د) غلے، پھل اور ایسے دیگر سامان بھی مستثنیٰ ہیں جنہیں تجارت کی غرض سے نہ تیار کیا گیا ہو کیونکہ ان پر تجارت کی شرطیت کے اعتبار سے ثابت نہیں ہوتی اور سامان تجارت کی زکوٰۃ کے لئے تجارت کی نیت کا ہونا شرط ہے۔

(ھ) غلام عشور سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی پہلی شرط ملکیت مفقود ہے عشور خواہ بصورت زکوٰۃ ہو یا ٹیکس مالک کے مال پر عائد ہوتے ہیں نہ کہ غلام پر۔

(۱۰) یہ محصول ہر قسم کے مال پر لگتا ہے۔

اس میں ہر قسم کے تجارتی مال شامل ہیں خواہ نقد ہوں یا قیمتی معدنیات سونا چاندی

یا مختلف قسم کی تجارتی اشیاء۔

بعض اشیاء مخصوص حالات میں مسلمانوں کے لئے عشور سے مستثنیٰ کر دی جاتی ہیں۔ عموماً یہ صورت حال جنگی ساز و سامان، کارخانوں کے مخصوص سامان اور پیداواری اشیاء درآمد کرتے وقت پیش آتی ہے۔ اس کو ہم "اصول ثابتۃ" کا نام دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس چھوٹ کے اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ یہ چھوٹ کارکردگی میں اضافہ، اچھی پیداوار، اور صنعت کے قیام میں معاون ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی وجہ سے ایسے اجزاء میں اضافہ ہوتا ہے جس کے بغیر پیداواری عمل آسان نہیں ہو سکتا اور جس کی وجہ سے بالآخر معاشرے کی ضرورت معقول قیمت پر پوری ہوتی ہے۔

ملکوں کے مالیاتی نظام کبھی کبھی اس طرح کی چھوٹ دینے کا انتظام کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بیشتر ترقی پذیر اسلامی ممالک تجارتی سامانوں پر Custom duties بھی عائد کر دیتے ہیں باوجودیکہ وہ ممالک شدید غربت کا شکار رہتے ہیں، اور انہیں پیداواری سامان درآمد کرنے کے بجائے خود ذاتی پیداوار بڑھانے کی زیادہ ضرورت رہتی ہے۔

(۱۱) حرام مال پر عشور نہیں ہیں

شراب اور خنزیر پر نفاذ عشور سے متعلق جو بحث گزر چکی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ بیشتر فقہاء کے نزدیک ان پر عشر نہیں ہے۔ جس طرح زکوٰۃ صرف حلال مال پر عائد ہوتی ہے اسی طرح عشر بھی صرف حلال مال پر عائد ہوتے ہیں خواہ وہ مال ذمی کا ہو۔ ہم اس کا مقابلہ انسانوں کے بنائے ہوئے وضعی قوانین سے کر سکتے ہیں جو حلال و حرام ہر چیز پر ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ نشہ آور چیزوں، شراب اور Night clubs کے تاجروں سے بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

(۱۲) عشور زکوٰۃ کے مخصوص مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔

مسلمانوں کے عشور انہیں آٹھ مدات میں خرچ کئے جائیں گے جن کی تعیین قرآن نے کر دی ہے اور اس کو ملک کی عمومی آمدنی کی فہرست میں نہیں رکھا جائیگا جبکہ

غیر مسلموں کے عشور مصالح عامہ کی خاطر کہیں بھی خرچ کئے جا سکتے ہیں۔

حواشی

(۳۷) ابن عابدین۔ رد المحتار علی الدر المختار شرح تنویر الابصار، دار سعادت مطبعۂ عثمانیہ

(۳۸) ابن قدامہ، المغنی علی الشرح الکبیر، ۱۳۴۶ھ ج ۲/ ص ۱۸ - ۱۹

(۳۹) ابو عبید ص ۵۲۱، ج ۲/ ص ۶۲۹

(۴۰) دیکھئے ابن قدامہ، مرجع سابق ج ۳/ ص ۳۲ - ۴۰

(۴۱) ابو عبید ص ۵۱۵-۵۱۶ (۴۲) ابو یوسف ص ۱۴۴ - ۱۴۵

(۴۳) یحیی بن آدم ص ۶۲ (۴۴) حوالۂ سابق ص ۶۱

(۴۵) ابو یوسف ص ۱۴۳ (۴۶) ابو یوسف ص ۱۴۳

(۴۷) ابو عبید ص ۶۴۲ - ۶۴۳ (۴۸) ابو عبید ص ۶۴۳ - ۶۴۴

(۴۹) " " ص ۶۴۵۔

(۵۰) دیکھئے ڈاکٹر شوقی اسماعیل شحاتہ، "تطبیق المعاصر للزکوۃ" دار الشروق ص ۱۸۱-۱۸۳

(۵۱) ابو عبید ص ۶۴۳ (۵۲) ابو یوسف ص ۱۴۶ - ۱۴۷

(۵۳) " ص ۶۴۳ (۵۴) ابو عبید ص ۶۴۷

(۵۵) ڈاکٹر ابراہیم فواد احمد علی۔ مرجع سابق ص ۲۱۱

(۵۶) ابو عبید ص ۶۴۱ (۵۷) ابو یوسف ص ۱۴۴

(۵۸) ابو عبید ص ۶۳ - ۶۴ (۵۹) ابو عبید ص ۶۳

(۶۰) ابو یوسف ص ۱۴۴ (۶۱) ابو عبید ص ۶۴ - ۶۵

(۶۲) ابو یوسف ص ۱۴۲ - ۱۴۳ (۶۳) ابو عبید ص ۶۳۷ - ۶۳۸

(۶۴) ابو عبید ص ۶۳۵ - ۶۳۶ (۶۵) ابو یوسف ص ۱۴۵

شہنواز قمر
متعلم جامعۃ الفلاح

اخبار علمیہ

اسلام کی روشنی

قاہرہ آر۔ ایم۔ اے ۱۹۸۹ء میں شیخ الازہر کے ہاتھ پر ۵۰،۶۰ افراد نے اسلام قبول کیا۔ یہ نومسلم یورپ، امریکا، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے۔

مذکورہ نومسلموں کے علاوہ کچھ اور بھی افراد اسلام کی روشنی سے مستفیض ہوئے جنہوں نے مصر کی دوسری تنظیموں اور اداروں کے روبرو اپنے اسلام کا اعلان کیا۔

نومسلم حضرات کے سب اسلامی تعلیمات کے مداح اور ان پر صدق دل سے عمل پیرا ہیں۔ ان حضرات کو مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں بھی فراہم کی گئی ہیں جن میں اسلام کے اصولوں اور بنیادی باتوں پر اجمالی اور تفصیلی بحثیں کی گئی ہیں۔

دنیا کا سب سے وزنی نسخہ قرآن کریم

پندرہ روزہ "حق و باطل"

انگریزی ماہنامہ اسلامک وائس میں شائع شدہ ایک اطلاع کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ اس وقت دنیا کا سب سے وزنی نسخہ قرآن کریم جلال پور، پاکستان میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے ہر پارے کا وزن (۵۰) پچاس کلوگرام ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مجموعی وزن (۱۵۰۰) کلوگرام ہے۔ اس نسخہ کو ایک پاکستانی خوش نویس جناب حاجی بشیر جلال پوری نے تحریر فرمایا ہے اور اس کی کتابت کی تکمیل دو سال کے عرصہ میں ہوئی۔

نسخہ مذکورہ کی کتابت ایسے مخصوص کاغذ پر ہوئی ہے جو امریکہ سے درآمدہ ہے

اس پورے نسخہ کو تیار کرنے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہوئے ہیں۔ اس نسخہ کی نمائش پاکستان کے ہر بڑے شہر میں کی جائے گی، اور پھر اسے فیصل آباد (پاکستان) میں واقع قرآنی عجائب خانہ میں بغرض حفاظت دے دیا جائے گا۔

(علوم القرآن) —

برطانوی مدارس میں اسلامی نظام تعلیم

برطانوی تعلیم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہاں کی وزارت تعلیم نے اسلامی نظام تعلیم پاس کیا جس کی رو سے اس سند فراغت حاصل کرنے والے طلباء کو عام برطانوی سکنڈری تعلیم کی سند دی جائے گی۔

(ماہنامہ التضامن الاسلامی)

برلن میں ایک اسلامی مدرسہ

مغربی المانیہ کے شہر برلن میں عنقریب اسلامی منصوبہ کے تحت ایک ابتدائی مدرسہ کا افتتاح ہوگا۔ اب تک ۲۵۰ طلبہ اور طالبات کا رجسٹر میں اندراج ہو چکا ہے۔ اس مدرسہ کی تعمیر کا کام جمعیۃ الانصار الاسلامیہ انجام دے رہی ہے۔ اور یہ خیال انھیں تب آیا جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کی تعمیر کی اشد ضرورت ہے۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ برلن میں مسلمانوں کی تعداد چار لاکھ تک پہونچ گئی ہے جس میں ۱۰ ہزار بچے ہیں۔ ماہنامہ (التضامن الاسلامی)

ملیشیائی پولس کو شرعی قوانین کی تدریس

حکومت ملیشیا نے یہ بات طے کی ہے کہ پولیس کے جوانوں کو اسلامی قوانین کی تعلیم اور اس کی تنفیذ کی تربیت دی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے الجامعہ الاسلامیہ العالمیۃ (انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی) کے زیر اہتمام ایک ٹریننگ کیمپ لگایا گیا جس سے پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں نے استفادہ کیا۔

(ماہنامہ — التضامن الاسلامی)

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ کے نئے ناظم

ناظم جامعہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی جہاں ایک زبردست عالم دین ہیں، وہیں متعدد گرانقدر کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ آپ کی بلند قامت علمی شخصیت کی وجہ سے جامعہ کو کافی نیک نامی حاصل ہوئی۔ لوگ آپ کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اہل علم کی نگاہیں عزت و احترام کے ساتھ آپ کے سامنے جھکتی ہیں، جامعہ کا آپ کے نام کے ساتھ جڑنا جامعہ کے لئے ایک اعزاز کی بات تھی، آپ کی معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور بالغ نظری کی بنا پر جامعہ کو جو فائدہ پہنچا ہے، جامعہ اسے فراموش نہیں کر سکتی۔

مسلسل خرابی صحت اور ضعف العمری کی وجہ سے آپکے مسلسل اصرار پر مجلس انتظامیہ نے جامعہ کی خدمت سے آپکی سبکدوشی کی درخواست منظور کر لی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ جامعہ اور ہم خادمانِ جامعہ کو آپ کی سرپرستی تاحیات حاصل رہیگی۔

۵؍ مئی ۱۰ء کو انتظامیہ نے اپنے اسی اجلاس میں جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو ناظم اور جناب حاجی عبد المتین صاحب کو نائب ناظم مقرر کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات بلریا گنج کے رہنے والے ہیں اور پہلے بھی مختلف ذمہ دارانہ عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کی مفوضہ ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

چند اساتذہ کی جدائی

شعبۂ عربی کے ایک لائق استاذ اور سابق سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جناب جاوید اشرف علیگ فلاحی

ایک عرصہ تک جامعہ سے وابستہ رہنے کے بعد اپنے حالات کی بنا پر اپنے وطن کو منتقل ہو گئے ہیں۔ موصوف نے جامعۃ الفلاح سے اپنی بعثت جامعہ اثریہ دار الحدیث کو منتقل کرالی وہ [illegible] میں بحیثیت طالبعلم جامعہ آئے تھے اور [illegible] میں فراغت ہوئی۔ فراغت کے فوراً بعد جامعہ میں استاذ اور اتالیق کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی۔ اس کے بعد مزید حصول تعلیم کی غرض سے دیار مقدس میں چند سال گذارنے کا شرف حاصل ہوا۔ تدریسی خدمات کے لئے دوبارہ موصوف نے جامعہ ہی کا انتخاب کیا لیکن آپ کے حالات نے مزید یہاں رہنے کی اجازت نہ دی اور ذمہ داران جامعہ نے افسوس کے ساتھ آپ کو یہاں سے رخصت کیا آپ کا حالیہ پتہ یہ ہے: جاوید اشرف صاحب فلاحی معرفت حاجی خلیل الرحمان صاحب بھیلی بازار مئو (یو۔پی)

تحریکی حلقے کے جانے پہچانے شاعر جناب تابش مہدی صاحب جامعہ میں کئی سالوں سے تجوید کے استاد تھے، تابش صاحب کے جامعہ آنے کے بعد طلبا کے اندر قراءت و تجوید کے شوق کو بالیدگی ملی، اور تجوید کے مختلف حلقے قائم ہوئے آپ نے تعلیمی سال سے اپنے حالات کی بنا پر یہاں سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ اس وقت آپ دیوبند میں ہیں۔ آپ کی اہلیہ راضیہ عثمانی صاحبہ کاتبہ تھیں، حیات نو کو کتابت کے سلسلے میں ان کا تعاون حاصل تھا۔ ادارہ ان کا مشکور ہے۔

جناب قاضی زین العابدین صاحب جامعۃ الفلاح میں سات سالوں سے شعبۂ اعلیٰ میں خدمات انجام دے رہے تھے آپ مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں یہاں آنے سے قبل موصوف گورنمنٹ اردو جونیر کالج آف ایجوکیشن بالاپور ضلع آکولہ (مہاراشٹر) میں بحیثیت پرنسپل تھے، ریٹائر ہونے کے بعد آپ

جامعہ تشریف لائے اور سات سال یہاں خدمات انجام دیں اور آپ یہاں سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں اور اس وقت صمد پبلک اسکول، بیدولہ چوراہا، ڈومریا گنج سدھارتھ نگر یوپی میں پرنسپل کی حیثیت سے موجود ہیں۔

ہمیں اپنے ان تینوں ساتھیوں کی جدائی پر افسوس ہے خدا ان کا حامی و ناصر ہو ہم بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ یہ جہاں کہیں بھی رہیں گے جامعہ اور حیات نو کو یاد رکھیں گے۔

تعمیرات

ہمارے قارئین واقف ہیں کہ جامعۃ الفلاح اپنے منفرد نظام تعلیم و تربیت کی بنا پر تشنگان علم کا مرجع بنا ہوا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی شائقین کی کثیر تعداد کو جامعہ میں وسائل کی کمی اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے بے نیل مرام واپس ہونا پڑا۔ اس سال بڑے محدود پیمانے پر داخلے ہوئے ہیں۔ ہمارے جن مہمانوں کو مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ ہمیں اس پر افسوس ہے لیکن ہم معذور ہیں۔ طلبہ کی تعداد اب - ۱۹ اور طالبات کی تعداد ۲۱۹۰ ہے۔

اس وقت سب سے اہم مسئلہ کلیۃ البنات کی تعمیر کا ہے۔ موجودہ عمارت اس کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اسی عمارت میں تعلیم بھی ہوتی ہے اور وہی رہائش گاہ کا بھی کام دیتی ہے، عمارت چھوٹی اور طالبات اتنی زیادہ، طالبات کو اس کی وجہ سے بڑی دشواریوں کا سامنا رہتا ہے۔ گرمی میں تو ان کی مصیبت دو چند ہو جاتی ہے۔ اس کا احساس سبھی کو تھا لیکن وسائل کی کمی سد راہ تھی۔ ادھر ذمہ داروں نے اس سب کے باوجود نئی تعمیر کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ بنیادوں کی کھدائی کا کام شروع ہو گیا ہے۔

عبد الاحد فلاحی صاحب کو صدمہ

ادارہ حیات نو افسوس کے ساتھ اطلاع دیتا ہے کہ برادر عزیز عبدالصمد

فلاحی صاحب کھیرا۔ سدھارتھ نگر۔ یو۔پی استاد مصباح العلوم چوکونیا بلکسنی کے والد بزرگوار جناب رحیم الحق صاحب ۶ رمضان المبارک بروز جمعہ شب میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم تحریک اسلامی سے طویل عرصے وابستہ تھے۔ جماعت اسلامی کے رکن اور مقامی ذمہ دار تھے۔ دعوت و تبلیغ سے خصوصی دلچسپی اور مطالعہ قرآن کا خاص شغف تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

طوفانی آندھی

انسان قدرت کے آگے کس قدر مجبور اور بے بس ہے۔ کبھی کبھی قدرت کی طرف سے ہلکا جھٹکا انسان کو اس کا احساس دلا جاتا ہے۔ انسانوں کو ختم کرنے اور بستیوں کو ویرانوں میں تبدیل کرنے کے لئے اس کا معمولی اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ہوا جس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے جب وہی اللہ کے حکم سے طوفان بنتی ہے تو بستیوں کی بستیاں اپنے مکینوں کے ساتھ تلپٹ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس طرح کے مواقع پر ہمیں اپنی احتیاج و بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ آتی ہی اس لئے ہیں کہ ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔ اپنے گناہوں سے تائب ہوں اور اپنے مولیٰ کی طرف پلٹیں۔

۲۳ مئی کو اس علاقے میں ایک زبردست آندھی آئی۔ ہم کیا اور ہماری بساط کیا، جو بھی اس آندھی کی زد میں آیا بچنا مشکل ہو گیا۔ لوگوں کا بہت نقصان ہوا۔ اللہ اللہ کرکے جب یہ آندھی تھمی ہے تو منظر یہ تھا کہ جامعہ کی چہار دیواری کا بیشتر حصہ زمین بوس ہو چکا تھا۔

دعائے صحت

ڈاکٹر احسان احمد صاحب فلاحی جو بلریا گنج سے متصل موضع ہنگائی پور کے رہنے والے ہیں، ادھر کئی ماہ سے سخت بیمار چل رہے ہیں۔ بمبئی میں زیر علاج ہیں۔ اعصاب میں حس باقی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی صحت بڑی اچھی تھی۔ مضبوط توانا جسم لیکن اب بچنا مشکل ہے۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اللہ انہیں صحت عاجلہ کاملہ عطا فرمائے اور ہم لوگوں کو اپنی صحت کی قدر کرنے کی توفیق دے۔